کلیاتِ مجاز

اسرار الحق مجاز

کتابی دُنیا - دہلی

کلّیاتِ مجاز

Mahmood Ali Collection

کلّیاتِ مجاز

اسرارُ الحق مجاز

© جملہ حقوق محفوظ!

KULLIATE MAJAZ

(Urdu Poetry)

by

Asrarul Haque Majaz

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-30-7

Price. Rs. 150/=

نام کتاب.....کلیات مجاز

شاعر.....اسرار الحق مجاز

سن اشاعت.....۲۰۰۲ء

قیمت.....

مطبع.....

Published by:

Kitabi Duniya

1955 ,Gali Nawab Mirza,

Mohalla Qabristan, Turkaman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E -mail kitabiduniya@rediffmail.coms

Phone:- 3288452

ترتیب

گل نغمہ ، ڈاکٹر محمد حسن ۹
چمن بھیا ، حمیدہ سالم ۳۱
میرا دوست میرا مہمان ، جاں نثار اختر ۵۰
عشقِ مجازی ، عصمت چغتائی ۵۷
تعارف ۷۹
نظمیں ۸۱
نذرِ جوش ۸۳
نذرِ دل ۸۳
مجبوریاں ۸۵
ایک دوست کی خوش مذاقی پر ۸۶
نغمۂ ٹیگور ۸۷
کس سے محبت ہے ۸۸
ایک غمگین یاد ۹۱
اُن کا جشنِ سالگرہ ۹۲
بربطِ شکستہ ۹۳
حسن و عشق ۹۴
نمائش میں ۹۵
آج کی رات ۹۷
نذرِ خالدہ ۹۹
رات اور ریل ۱۰۳
انقلاب ۱۰۷
شوقِ گریزاں ۱۱۱
خانہ بدوش ۱۱۳
نورا ۱۱۴
ننھی پجارن ۱۱۸
نذرِ علی گڑھ ۱۱۹
دلی سے واپسی ۱۲۱
مسافر ۱۲۳

اندھیری رات کا مسافر ۱۲۴
طفلی کے خواب ۱۲۷
نوجوانوں سے ۱۲۹
نوجوان خاتون سے ۱۳۰
پردہ اور عصمت ۱۳۱
آوارہ ۱۳۳
سرمایہ داری ۱۳۷
ہمارا جھنڈا ۱۳۹
ساقی ۱۴۱
ایک جلاوطن کی واپسی ۱۴۲
مزدوروں کا گیت ۱۴۴
مزارِ رہنما ۱۴۷
ادھر بھی آ ۱۴۸
خوابِ سحر ۱۴۸
شکوۂ مختصر ۱۵۰
گریز ۱۵۱
شہر نگار ۱۵۲
آہنگ نو ۱۵۳
عشرتِ تنہائی ۱۵۶
عیادت ۱۵۸
مادام ۱۵۹
آج بھی ۱۶۰
لکھنؤ ۱۶۲
مجھے جانا ہے اک دن ۱۶۳
شرارے ۱۶۵
اعتراف ۱۶۶
الہ آباد سے ۱۶۹
بول اری او دھرتی بول ۱۷۰
مہمان ۱۷۱
آج ۱۷۳
بتانِ حرم ۱۷۵
پہلا جشنِ آزادی ۱۷۷
وطن آشوب ۱۷۹
فکر ۱۸۰
سانحہ ۱۸۲
خراجِ عقیدت ۱۸۴
زہرابِ حسن ۱۸۵
شمعِ رہگزر ۱۸۶
نیا کشمیر ۱۸۷
پاکستان کا ملی ترانہ ۱۸۷
غزلیں ۱۸۹

HaSnain Sialvi

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے	۱۹۱
سارا عالم گوش بر آواز ہے	۱۹۲
کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں	۱۹۳
حسن کو بے حجاب ہونا تھا	۱۹۳
یونہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر	۱۹۴
رہ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں	۱۹۵
سینے میں اُن کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں	۱۹۶
خامشی کا تو نام ہوتا ہے	۱۹۷
نگاہ لطف مت اُٹھ خوگر آلام رہنے دے	۱۹۸
عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ	۱۹۹
یہ میری دنیا یہ میری ہستی	۲۰۰
خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردہ کرے کوئی	۲۰۱
کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورش دوراں بھول گئے	۲۰۲
حسن پھر فتنہ گر ہے کیا کیجے	۲۰۳
برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ	۲۰۴
وہ نقاب آپ سے اُٹھ جائے تو کچھ دور نہیں	۲۰۵
اذن خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم	۲۰۶
مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں	۲۰۷
نہ ہم آہنگ مسیحا، نہ حریف جبریل	۲۰۸
عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جانا تھا	۲۰۹
سازگار رہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا	۲۱۰

ساقیِ گلفام باصد اہتمام آ ہی گیا ۲۱۱
شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا ۲۱۳
آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے ۲۱۳
نہیں یہ فکر کوئی رہبرِ کامل نہیں ملتا ۲۱۵
جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے ۲۱۶
جگر اور دل کو بچانا بھی ہے ۲۱۷
دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی ۲۱۸
عاشقی جانفزا بھی ہوتی ہے ۲۱۹
پرتوِ ساغرِ صہبا کیا تھا ۲۲۰
یہ جہاں بارگہِ رطلِ گراں ہے ساقی ۲۲۰
دلِ خوں گشتۂ جفا پہ کہیں ۲۲۱
دردکی دولتِ بیدار عطا ہو ساقی ۲۲۲
گیت ۲۲۳

ڈاکٹر محمد حسن

گُلِ نغمہ

(مجاز کے متعلق میری ڈائری کے چند اقتباسات)

ہفتہ ۱۸ فروری ۱۹۵۶ء

مجاز بھائی!

معاف کیجئے گا آپ کی یہ امانتِ خصوصی عام کر رہا ہوں۔ آپ نے رانچی میں ایامِ جنوں میں جو غزلیں اور نظمیں کہی تھیں وہ بھی اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں اب ان کی نوعیت ایک مقدس یادگار کی ہے اور اس یادگار کو پیش کر دینے میں میں کیوں بخل کروں۔

آپ نے اپنی تصویر مجھے عنایت کرتے ہوئے اس کی پشت پر جوش کا یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

هم آئینہ میں اپنے حال کی تعبیر دیکھیں گے
تمہارے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھیں گے

آپ کی رخصت کے بعد میں نے کئی بار کوشش کی ہے کہ اپنے ہاتھ سے آپ کی کوئی تصویر کھینچ سکوں۔ ناکام رہا۔ آخر خود آپ ہی کے ہاتھوں کھنچی ہوئی آپ کی تصویروں کی تو پیش کر دی۔ پتہ نہیں آپ میری ڈائری میں محفوظ کی ہوئی ان جھلکیوں کو دیکھتے تو کیا کہتے۔ کاش کہ آپ انہیں دیکھ لیتے۔

کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

محمد حسن

ہفتہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۰ء

آج رات مجاز آ گئے بے پناہ چاندنی بکھری ہوئی تھی تو بہ شکن چاندنی۔ بہت رات گئے تک باتیں کرتے رہے غزلیں سنتے رہے، شعر و شاعری ہوتی رہی غرضیکہ بڑی دلچسپ صحبت رہی۔ باتوں باتوں میں ایک نکتہ پہ بارہا سوچا تھا مگر اس قطعیت کے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ سوچا یہ حافظ، جوش اور مجاز کے ہاں نشاط کا تصور کیا ہے۔ مجاز نے کہا اور بڑے پتے کی بات کہی کہ جوش کے نشاط میں عیاشی کی بُو آجاتی ہے جب کہ حافظ کا نشاط درد آشنا ہے اپنی نظم "آج" کے بارے میں بھی ایک اچھی بات کہی اور اس کی شعوری اور غیر شعوری ترتیب پر اچھی طرح روشنی ڈالی۔

اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

حُسن سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے ان کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

میں نے کہا تھا کہ یہ شعر ساری نظم کی فضا سے علیحدہ ہے۔

مجاز نے جواب میں کہا کہ ہم آخر کے شعروں میں سے ہر شعر میں معشوق سے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے لب و رخسار کی بات، پھر "انگبیں پینے کی سرکش آرزو" سے لے کر "کلاہ فخر انسانی" تک بات پہنچتی ہے اور اس سے پہلے کہ نظم میں عیاشی اور لذتیت جگہ پائے شاعر پھر احترام لب و رخسار کی طرف رجعت کر جاتا ہے اور اس شعر سے فاصلہ قائم کر دیتا ہے ؎

حُسن سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے ان کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

دوشنبہ ۳۱ اگست

مجاز سے ملاقاتیں! کافی ہاؤس کی وہی پرانی جانی پہچانی شام جس میں باتوں باتوں میں

فراق کے شعر جگمگا اُٹھے ہیں ؎

فرشِ میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ — دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی
خاک میں چوٹ دبی تھی یہ نہ جانے کب کی — رگِ پیمانہ لہو دینے لگی اے ساقی

آج مجاز کی نئی غزل سنی ہے جو کسی مشاعرے کے لئے طرح میں کہی ہے، بڑی انکساری اور معذرت کے ساتھ سنائی ؎

بس اس تقصیر پر اپنے مقدر میں ہے مر جانا — تبسم کو تبسم کیوں نظر کو کیوں نظر جانا
خرد والوں سے حسن و عشق کی تنقید کیا ہوگی — نہ افسونِ نگہ سمجھا نہ اندازِ نظر جانا
مے گلفام بھی ہے سازِ عشرت بھی ہے ساقی بھی — مگر مشکل ہے آشوبِ حقیقت سے گزر جانا

غمِ دوراں میں گزری جس قدر گزری جہاں گزری
اور اس پر لطف یہ ہے زندگی کو مختصر جانا

یہ لکھنؤ ہے یہاں کی اُجڑی ہوئی صحبتوں کا یہ گداز، یہ لطافت اور شیرینی اور کہاں ملے گی یہ اُجڑی ہوئی بیوہ کا سہاگ ہے جس کے لاکھ لُٹ جانے پر بھی غضب کا نکھار ہے۔ سردی کی پچھلی راتوں کی چاندنی، ڈھلتی ہوئی دھوپ اور گلِ نغمہ جو آپ اپنی شکست کی آواز ہے۔

۱۴، اکتوبر ۱۹۵۵ء

کل رات شراب کی میز پر مجاز نے نشہ کے بہکے ہوئے لہجے میں وہی بات کہی: "ہائے وہ تصور جو دامن نہیں چھوڑتا۔ ہائے وہ خیال جو دل کے گوشے سے نکلتا ہی نہیں اس کا کوئی کیا علاج کرے؟"

چہارشنبہ ۔ ۱۰ نومبر

آج اسرار الحق مجاز کی قیام گاہ پر غالب سوسائٹی کا جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ سالہا سال کے

بعد یہ ہماری پہلی پبلک سرگرمی تھی۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ بڑی خوشگوار اور دلکش فضا تھی۔ یہ ابتدا بہت ہی عمدہ رہی ہے ایک طرف تو ہمارا اجتماع بڑا ہی نمائندہ تھا اور آئندہ اس سے زیادہ نمائندہ ہونے کی امید ہے۔ آنند نرائن ملا، آل احمد سرور، جی۔ پی جوہری، ڈاکٹر وحید مرزا سبھی موجود تھے۔ احتشام صاحب نے اپنا مقالہ "غالب کا تفکر" پڑھا دوسرے اس نے مجاز کو پھر سے ذرا سرگرم عمل کر دیا ہے۔

اتوار ۱۵ نومبر

مجاز پھر بیمار ہو گئے ہیں۔ آج کی شام انہی کے ساتھ گزاری گھر پر شام گزارنے کا یہ موقع مجاز کے لئے نیا ہی تھا۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے مجاز کا "نیا ادب" کا زمانہ پھر سے لوٹتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ مجاز سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہو گیا۔ بہت دیر تک افسوس کرتے رہے۔ اچھا آدمی مر گیا۔ مجھے وہ شعر یاد آیا جسے ایک مدت تک اقبال کا سمجھتا رہا تھا۔

زلفِ آوارہ، گریباں چاک، اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

اور مجاز نے ایک شعر سنایا ایک مصرعہ یاد رہ آگیا۔

اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج

بتاریخ ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء

شام کو مجاز سے ملاقات ہوئی مجاز نے آٹھ اشعار کی ایک نظم گاندھی جینتی کے سلسلے میں ریڈیو کے لئے کہی ہے وہ واقعہ مجھے یاد ہے کافی ہاؤس میں میاذ انصاری، میں، مجاز اور ایک کوئی اور صاحب بیٹھے تھے میاذ نے کہا۔ گاندھی جینتی کے مشاعرے کے لئے وہ نئی نظم لکھ دو چار پانچ نئے شعر لکھ دو تو تمہیں لے لیں گے۔"

مجاز نے کہا، "پچاس روپے لیں گے۔"

عیاذ بولے: "اچھا چلو، پچاس روپے ہی دیں گے فی شعر دس روپیہ مگر لکھ ضرور لینا۔"

میں نے عیاذ سے کہا کہ بھئی ان سے شعر لکھوانے کی بہترین صورت وہی ہے جو بمبئی کے کچھ دوستوں نے نکالی ہے دو بوتل شراب کے ساتھ کمرے میں بند کر دو باہر نکالو گے تو غزل تیار ملے گی۔"

دوسرے صاحب بولے کہ "اس وقت تو فردوسی کا سا نذرانہ مل رہا ہے مجاز کو ہر شعر پہ دس روپیہ۔"

مجاز نے برجستہ کہا: "جناب! فردوسی نے تو محمود سے لیا تھا۔ ہم عیاذ سے وصول کر رہے ہیں۔"

آج وہ غزل مکمل ہوئی تو بڑی بے تابی سے سنائی اور کہا مجھے آج یہ اشعار لکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی لکھ سکتے ہیں، صلاحیتیں مردہ نہیں ہوئی ہیں اور حقیقتاً مجاز کے اپنے رنگ کی جھلکیاں کچھ اشعار میں نمایاں ہیں۔

وہ کلیم عصر حاضر.....

آج آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے کی اپنی تصویر مجاز نے مجھے دی ہے اس کی پشت پر یہ عبارت لکھی ہے:

"محمد حسن کو جوش کے اس شعر کے ساتھ ؎

ہم آئینہ میں اپنے مآل کی تغیر دیکھیں گے
تمہارے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویر دیکھیں گے

شاید یہ اشارہ اس خواہش کی طرف ہے جو میں نے ان کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں اکثر ظاہر کی ہے اس سلسلے میں سارا مواد یک جا کر لینا چاہتا ہوں۔

دوشنبہ، ۱۸ اکتوبر

مجھ میں ڈائری لکھنے کی سلت نہیں ہے صرف مجاز کی خاطر یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

اختر شیرانی سے مجاز کی پہلی ملاقات کا حال پوچھا تھا۔

مجاز نے کہا: "اختر شیرانی کی پہلی نظم میں نے غالباً ۱۹۳۰ء میں پڑھی تھی جو مولانا محمد علی پر کہی گئی تھی پھر "نمائش" کے سلسلے میں اختر شیرانی سے خط و کتابت شروع ہوئی انہوں نے وہ نظم مانگی تھی میں اس کے بعد کبھی کبھی ان کو نظمیں بھیجتا رہتا تھا۔ پھر کسی کام سے وہ دہلی آئے اور صرف مجھ سے ملنے کے لئے علی گڑھ چلے آئے میں گھر پر نہیں تھا، پرچہ چھوڑ گئے لکھا تھا:

"میں تم سے ملنے علی گڑھ آیا ہوں اب رشید صاحب صدیقی کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"رشید صاحب کے ہاں پہنچا تو رشید صاحب نے کہا" ہاں آئے تھے پوچھتے تھے سلیمہ سلطانہ کہاں رہتی ہے میں نے کہا مجاز سے رجوع کیجئے۔" غالباً اس طالبۂ علم سے خط و کتابت رہی ہوگی۔ میں اسٹیشن گیا تو ملاقات ہوئی صرف کرتہ اور پاجامے میں تھے اور وہ بھی ملگجا، بال الجھے ہوئے میں سمجھ گیا کہ اختر یہی ہیں۔ ان کو ساتھ لے آیا اور کنگ والی کوٹھی میں دو لڑکے جو میرے دوست تھے اور ذرا مرفہ الحال تھے، ان کے ہاں ٹھہرا دیا۔"

اور باتیں نکل آئیں سینٹ جونس کالج آگرہ کا ذکر آیا کہنے لگے۔ کالج میں مشاعرہ ہوا جذبی اور میں ہم جماعت تھے۔ سرور کچھ سینئر تھے۔ حامد حسن قادری صاحب نے وہاں انجمن ترقیٔ اردو کی شاخ قائم کر رکھی تھی۔ تینوں نے نظمیں یا غزلیں اس مشاعرے کے لئے لکھیں مجاز کو اس مقابلے میں بہترین غزل پر گولڈ میڈل ملا۔ اس واقعے کا تذکرہ مجاز کئی بار بڑے ولولے کے ساتھ کر چکے ہیں۔ غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں:

یوں ہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر — بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر
وہی جلوے جوابِ نکہتِ دامن لئے گریاں تھے — نظر میں رہ گئے گل ہائے دامانِ نظر ہو کر

فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں ارے توبہ
یہ نالے نارسا ہو کر یہ آہیں بے اثر ہو کر!

نئی غزل جو رائے بریلی کے طرحی مشاعرے کے لئے کہی ہے سنائی۔ یہ دوسری غزل ہے۔

جو پچھلے چند ہفتوں میں مجاز نے کہی ہے پہلی وہ نظم ہے جو گاندھی جی کے سلسلے میں کہی تھی:

دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی — عشق نا پختہ ابھی جذبِ دروں خام ابھی
خود جھجکتا ہوں کہ دعویٰ جنوں کیا کیجئے — کچھ گوارا بھی ہے یہ قیدِ در و بام ابھی
یہ جوانی تو ابھی مائل پیکار نہیں — یہ جوانی تو ہے رسوائے مے و جام ابھی
واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا — ورنہ بدنام نہ ہوتی مئے گل فام ابھی

میں بصد فخر یہ زاہد سے کہتا ہوں مجاز
مجھ کو حاصل ہے شرفِ بیعتِ خیام ابھی

---

۱۱ اکتوبر

نیاز فتح پوری کے مکان کے قریب ہی ایک حجام کی دکان ہے، شاعری سے شوق رکھتا ہے۔ خود بھی شعر کہتا ہے اور شاعروں کے بال کاٹنے کا شغف رکھتا ہے۔ جگر، احسان دانش وغیرہ کے بال کاٹنے پر فخر کرتا ہے۔ مجاز سے تین چار سال سے تقاضا کر رہا تھا۔ آج مجاز اس کی طرف گئے تھے، بال کٹوا کر میرے ہاں آئے۔

دوشنبہ ۱۲ نومبر

مجاز سے ملاقات ہوئی، کشمیر کے مشاعرے سے پرسوں واپس آئے ہیں اور غالباً زندگی میں پہلی بار ایک سو چونسٹھ روپیہ کی چیزیں گھر والوں کے لئے خرید کر لائے ہیں۔ گھر میں جشن ہو رہا ہے باقاعدہ نیاز دلائی گئی کہ "رو کا آخری عمر میں مسلمان،، ہوا ہے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع ہے۔ دہلی میں آزاد کتاب گھر والوں سے "آہنگ،، کا ایک مکمل اور مبسوط ایڈیشن چھاپنے کے لئے بات چیت ہو رہی ہے۔

۱۲، دسمبر

صبح مجاز آگئے تھے۔ ان کے ساتھ احتشام صاحب کے ہاں گیا اور پھر مجاز کے اصرار پر ہم سب آنند نرائن ملا کے ہاں ان کے بھائی پی۔ این۔ ملا کے شدید طور پر زخمی ہو جانے پر عیادت اور اظہارِ ہمدردی کرنے کے لئے گئے آل حسن بھی ساتھ تھے۔ مجاز اس کے بعد امیر رضا صاحب کے ہاں چلے گئے وہیں کھانا کھائیں گے اور شام تک پنگ پانگ کھیلیں گے۔ آج کل ہفتے میں ایک دن پنگ پانگ کھیلنے وہاں ضرور جاتے ہیں۔

مجاز نے مجھے بتایا کہ وہ اس سال اردو ایم۔ اے کا امتحان علی گڑھ سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دینے کا ارادہ کر رہے ہیں کیونکہ ان کی والدہ کو یہ ارمان ہے کہ وہ ایم۔ اے پاس کریں۔ مجھے اس شخص کی باترتیبی پر حیرت ہو رہی ہے۔ کتاب کے بارے میں اس قدر سنجیدہ۔ بار بار اس پر اصرار ہے کہ تم دیباچہ لکھ دو۔ ملا صاحب کے ہاں جانے کے لئے نہ صرف خود آمادہ بلکہ ہمیں اور احتشام صاحب کو لے جانے کے بھی وہی محرک ہوئے۔

ہفتہ یکم مارچ ۱۹۵۲ء

یونیورسٹی پہنچا، پتہ چلا مجاز آئے ہیں اجمیر کے مشاعرے کے بعد دہلی اور اس کے بعد کچھ عرصے علی گڑھ رہ گئے تھے معلوم ہوا پروفیسر مسعود حسن رضوی کو نئی غزلیں سنا کر گئے ہیں۔ تعجب ہوا مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے کے کورس کی ایک نقل دے گئے ہیں۔ ۲۴ سے امتحان ہے کافی ہاؤس میں ملنے کو کہہ گئے ہیں۔

کافی ہاؤس پہنچا تو وہ حالت تھی جیسی شراب پینے کے بعد ہوتی تھی۔ چہرہ کھلا ہوا باتیں برابر کرتے جا رہے ہیں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اپنے اور بعض اپنے بارے میں باتیں۔ شراب کے لئے دو روپے مانگے میں نے دے دیئے مگر تعجب ہوا۔ مجھ سے کبھی وہ روپیہ نہیں مانگتے تھے۔ بھٹنک ہوٹل حضرت گنج میں جا کر بیٹھے۔ وہ ایک اور لوگوں کو راستے سے

پکڑلیا اور شعر سنانے لگے۔ دو قطعے سنائے جو جوش صاحب کے خلاف لکھے تھے ؎

خلق رسوا دہن دریدہ ہے یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے

رند بربادکو نصیحت ہے شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

[یہاں "پند نامہ برائے میاں مجاز"، اور جوش صاحب کی لکھی ہوئی ایک نظم کی طرف اشارہ ہے جس میں شیخ عبداللہ وزیراعظم کشمیر کی مدح کی گئی تھی]

پیر جوش شباب کیا جانے شورشِ اضطراب کیا جانے

سینۂ انقلاب چھلنی ہے شاعرِ انقلاب کیا جانے

قطعے سنائے، پھر خود ہی شروع ہوگئے۔ "کرشن چندر نے کہا کہ مجاز اگر طنز۔ اس خوبصورتی کے ساتھ نظم ہو سکتا ہے تو میں اپنا قلم واپس لیتا ہوں۔"

"میں نے کہا" نہیں کرشن تم اس قدر خوبصورت زبان لکھنے والے ہو۔ تم تو شاعر ہو تمھیں افسانہ نگار کون کہتا ہے۔" تو مسکرانے لگا۔

"اور جوش نے کہا کہ مجاز پھر پاگل ہوگیا ہے۔ پہلے پاگل ہوا تھا تو سبط حسن کو گالیاں دیتا تھا۔ اب کے مجھے بڑا بھلا کہتا پھرتا ہے۔ مگر آدمی GENUINE اور پُر خلوص ہے۔" اختر ملیح آبادی نے کہا کہ "چچا جان! اور ذہین بھی ہے۔"

اس پر جوش نے کہا "یہی تو مصیبت ہے۔"

یہ لطیفہ سنا کر بہت خوش ہوتے۔

جب تک یہ لطیفہ بیان ہو رہا تھا تو مجھے شبہ ہوا کہ جوش کا اندازہ شاید صحیح ہے۔ لیکن اس وقت تک میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ کافی ہاؤس میں آنے سے پہلے بھی شراب پی ہوگی اسی لئے بہک رہے ہیں لیکن بعد کو اندازہ ہوا کہ یہ خیال درست نہ تھا۔

غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ نظم تھی "کیف بادہ دانی"

حسن اک کیف جاودانی ہے

پھر غزل سنائی جس کا شعر ہے ؎

کیوں مجازؔ آپ نے ساغر توڑا   آج یہ شہر میں چرچا کیسا تھا

اور اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی سُنایا۔

سہیلؔ عظیم آبادی نے کہا تھا کہ اس بحر میں جمیلؔ مظہری نے اعلیٰ ترین غزل کہہ دی ہے اب اس میں تم سے تو کیا جوشؔ اور جگرؔ جیسوں سے غزل ہونی دشوار ہے۔ بولے "میں نے آزاد ہند ہوٹل، جامع مسجد دہلی کے اسی کمرے میں دو بج کر پانچ منٹ سے لے کر ڈھائی بجے تک کے وقت میں یہ غزل افضل پشاوری کو بولی ہے۔ میں بولتا گیا وہ لکھتا گیا۔ وہ اس کا گواہ ہے۔"

غزل یقیناً اچھی تھی جب اس شعر پر پہنچے ؎

کیوں جوانی تھی مجھے یاد آئی   میں نے اک خواب سا دیکھا کیا تھا

تو بولے اس سے ایک رات قبل ہی میری عمر پورے چالیس برس کی ہوتی تھی۔

دوسری غزل اور وہ نظم اس کے مقابلے میں زیادہ اچھی نہ تھیں۔ لیکن اپنی طبیعت کی اس جولانی اور اُبال پر بڑا فخر تھا۔ بڑی ادا کے ساتھ کہنے لگے:

"I have been drinking poetry in the night and vomiting poetry in the day."

(میں رات بھر شاعری پیتا رہا ہوں اور دن بھر شاعری اگلتا رہا ہوں)

بار بار "آہنگ" کے نئے ایڈیشن کے انتساب کا ذکر کرتے تھے اور داد چاہتے تھے۔

فیضؔ اور جذبیؔ کے نام جو میرے دل و جگر ہیں

مخدومؔ اور سردارؔ کے نام جو میرے دست و بازو ہیں

شنکر لال چیف کمشنر دہلی کی بھتیجی یا بھانجی کی شادی کا دعوت نامہ جیب میں رکھے ہوئے

تھے۔ یہ ہندی میں چھپا ہوا تھا۔ اسے بار بار نکال کر پڑھتے تھے اور اس کی عبارت کی تعریف کرتے تھے۔ عبارت یہ تھی:

"سدھا

جسے اب تک ہم نے کیول (صرف) اپنا ہی سمجھا

کو

کرشن کمار کو سونپتے ہمے

آپکے درشن کی

آشا ہے۔"

ملک راج آنند سے اپنی لڑائی کا ذکر کرنے لگے۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے بہت تذکرے ہوتے رہے۔ دہلی میں ہونے والے ایک مشاعرے میں بار بار ذکر کر رہے تھے جو چیمسفورڈ کلب میں ہوگا اور جس میں پاکستان کے بارہ شاعر شرکت کریں گے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے نہیں ویزا ملیں گے۔ نواب صاحب پٹودی کا بہت ذکر کرتے رہے۔

اپنی نظم "حسن ایک کیف جاودانی ہے" کے بارے میں کہنے لگے کہ علی گڑھ میں خلیل الرحمن اعظمی نے کہا کہ اس نظم میں تم کیٹس سے آگے نکل گئے ہو جس نے کہا تھا "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے"۔ اب تک اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہے تھے۔

جذبی سے لڑائی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور ایک قطعہ پڑھتے ہیں جو حیدرآباد سے رنگ کال پر کسی نے سنایا تھا اور جو غالباً خود مجاز ہی کا لکھا ہوا ہے۔

یہ علی گڑھ نہیں ہے بلدہ ہے　　مرغیوں کا حسین دڑبہ ہے

کوئی چھیڑے نہ میرے شاعر کو　　ہوں گے جذبی بھی یہ تو جذبہ ہے

دہلی میں شبیر حسین زیدی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ شہرزاد کے رقص کے تذکرے میں دو جملے خاص طور پر بار بار کہتے ہیں:

"Soviet embally speaks, chinese embassy delays."

پتہ نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟

دوسرا جملہ یہ ہے کہ "چار نوکریاں اور دو بیویاں میرے گرد گھوم رہی ہیں اب پھر دہلی واپس جانا ہے اور پھر بھگتنا ہے انہیں۔"

سنتے سنتے اکتا گیا۔ ناک میں دم آگیا۔

معلوم ہوا کہ کتاب میں میرا لکھا ہوا دیباچہ شامل نہیں ہو سکا ہے اور "آہنگ" کی ترتیب میں آخری نظم "زہراب حسن" ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے:

حسن ایک کیف جاودانی ہے

یو۔پی حکومت کے محکمۂ اطلاعات میں پہنچے اور گاندھی جی پر جو نظم ان کے رسالے "اطلاعات" میں چھپی تھی اس کا معاوضہ علی جواد زیدی سے طلب کیا۔ یہ انہوں نے سارے فائل نکلوائے اور خاص طور پر کلرک کو اسی کام میں لگایا۔ کافی دیر فائلیں الٹنے پلٹنے اور پریشان ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ معاوضہ پہلے ہی وصول کر چکے ہیں اور اس کی دستخطی رسید فائل میں موجود ہے۔

مجاز پاگل ہو گیا ہے — لیکن یہ حقیقت اس وقت میرے اوپر منکشف نہیں ہوئی۔

یہ دوسرے دن معلوم ہوا اور اسی وقت میں نے اس پاگل پن کی وجہ بھی ڈھونڈھ نکالی۔

مجاز کا پاگل پن ایک دائرہ میں چلتا ہے۔ پتہ نہیں لوگ اسے کیوں نہیں پہچانتے۔

پہلے خاموش۔ پھر کچھ ذرا سی زندہ دلی — باقاعدگی — پھر خواہش — پھر رکاوٹیں — پھر عشقِ بے پناہ — شکست — جنون — پھر خاموشی — اور پھر وہی سلسلہ۔

پھر وہ قدیمی نوٹ بک جس میں مختلف ٹیلی فون نمبر درج ہیں، ان کی جیب سے بار بار باہر نکلنے لگی۔

اتوار ۱۰ مارچ

صبح مجاز کے ہاں پہنچا کیونکہ ابھی تک یہ خیال راسخ نہیں ہوا تھا کہ مجاز واقعی پاگل ہو

گئے ہیں۔ صبح ۸ بجے پہنچا تھا۔ مگر چائے پی چکے تھے۔ اس قدر صبح سویرے بیدار ہو جانا یقیناً ایک معجزے سے کم نہیں۔ معلوم ہوا کہ انہیں علی گڑھ سے والدہ کے نمونیہ میں مبتلا ہو جانے کی غلط خبر دے کر بلایا گیا ہے اور ان کے بہنوئی ابو سالم صاحب جو علی گڑھ میں ہیں ہفتے کے روز آنے والے ہیں۔ اس وقت تک خود بھی یہاں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ "پھر کلکتہ کی امن کانفرنس میں جاؤں گا وہاں کے لئے ضرور نظم لکھنا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

مجاز پاگل ہو گیا میں اپنی آنکھوں کے سامنے بحران کی کیفیت دیکھ رہا ہوں۔ وہی ۱۹۴۵ء والا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ بولتے بولتے آواز بیٹھ گئی تھی لیکن زبان نہ تھکتی تھی۔

اپنے وطن ردولی کا قصہ سنانے لگے کہ ان کے ایک چچا نواب حسن فوق تھے جو پاگل تھے۔ جامدانی کی شیروانی پہنے، سر پہ صافہ باندھے چھوٹی سی داڑھی — بقول مجاز "بالکل میرتقی میر لگتے تھے بالکل میر" — سنگھاڑے کی گولیاں پتے میں بھرے سوکھے تالاب میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک شعر کہہ لیا، ایک گولی کھا لی۔

ان کے شعر سناتے رہے اور افسوس کرتے رہے کہ ان کا کلام ضائع ہو رہا ہے۔ مخدوم انصاری کا پتہ بھی لکھایا کہ ان سے کچھ مل جائے تو ضرور جمع کر کے چھپا دینا۔ شعر یہ تھے ؎

ابھی چاہیں تو تم کو بے وفائی کی سزا دے دیں
تمہارا نام رکھ دیں عہد و پیماں بھولنے والے

کہنے لگے شاعر کا انا یہاں پوری طرح شباب پر آتا ہے۔ ان کی ایک اور غزل کے چند شعر سنائے ؎

برس رہا ہے جو بر سے سحاب کیا ہوگا
ہمارے دیدۂ تر کا جواب کیا ہوگا

یہی نہ ہوگا کہ در در کی خاک چھانیں گے
بس اور اسے دل خانہ خراب کیا ہوگا

جو عہدہ دار جنوں ہیں انہیں خطاب ملے
میں بادشاہ ہوں میرا خطاب کیا ہوگا

ایک اور شعر انہی کا سنایا ؎

کسی کا فریہ آتا ہے شباب آہستہ آہستہ

کہ جیسے ہو عروج آفتاب آہستہ آہستہ

اس کے بعد ہری چند اختر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دو شعر دکھائے اور ان کی تعریف کی۔ شعر یہ تھے ؎

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا

مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی

ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

پھر گھر سے نکلے راستے میں کہنے لگے کہ روسی اور چینی سفارت خانوں میں جگہ مل رہی ہے۔ ایک جگہ اردو پڑھانے کی ہے دوسری رسالے کی ادارت کی مرزا و تم ناگر بھی میرا یار ہے جو ہندی رسالے کی ادارت کرتا ہے۔ یہ رسالہ سوویت بھومی بھی روسی سفارت خانے سے نکلتا ہے'' وغیرہ۔

پھر ہم لوگ ٹہلتے ہوئے سرور صاحب کے ہاں پہنچے گورکھپور کے ایک صاحب عبیدالرحمن اور عیاذ انصاری آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ والے بھی تھے پہلے نظمیں اور غزلیں ہوتی رہیں پھر سینٹ جانس کالج آگرہ کا ذکر چھڑ گیا۔ جب سرور صاحب نے ایک ڈبیٹ میں اقبال کی حمایت کی تھی اور انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر بتایا تھا اور مجاز نے غالب کی۔ اس وقت کے اپنے حلیے کا بڑا ہی اچھا بیان کیا تھا۔ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے اور اس پر ہلتے ہوئے پھندنے کے ساتھ غالب کی حمایت کرنے کھڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد جذبی اور اپنے ہم جماعت ہونے کا ذکر کرنے لگے۔ دونوں سائنس کے طالب علم تھے جذبی اس زمانے میں ملال تخلص کرتے تھے اور مجاز، شہید کے نام سے لکھتے تھے۔ ایک بار دونوں نے سینما جانے کا پروگرام بنایا۔ پہلے وارڈن صاحب سے اجازت

لینے کے لئے مجاؔز پہنچے مہاجن صاحب ان دنوں وارڈن تھے۔ مجاؔز نے پہلے جاکر غلط سلط انگریزی میں پوچھا:

"Sir. I want to go to cinema."

خیر اجازت مل گئی۔ اس کے بعد مجاؔز پہنچے۔ اس سے پہلے کہ یہ کچھ کہیں مہاجن صاحب نے خود ہی کہا:

"I was expecting you. You can also go to pictures."

"آیئے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی سینما دیکھنے جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد اپنے ایک اور ہم جماعت کا ذکر کرنے لگے جو بے حد شریر تھا۔ ایک عیسائی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا کسی نے بتایا کہ اس کو رام کرنے کے لئے اُلّو کا دل کھلاؤ۔ لہذا جاڑے کی راتوں میں رات رات بھر غلیل لے سڑکوں پر اُلّو مارتے پھرتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے صبح کو اُلّو ہاتھ آیا اور اس کا دل نکال کر اس لڑکی کو لے جا کر کھلایا مگر وہ پھر بھی مہربان نہ ہوئی۔

فانؔی کے بارے میں بہت سے قصّے سنائے۔

پہلی بار جب اصلاح لینے گئے تو فانؔی صاحب میکش اکبر آبادی کے ہاں آگرہ میں تھے۔ میکش صاحب کے مکان کے دونوں طرف طوائفیں رہتی ہیں اور بیچوں بیچ میں میکش صاحب کا مکان ہے۔ پہلی غزل ڈرتے ڈرتے انھوں نے سنائی۔

فانؔی نے میکش صاحب کو مخاطب کر کے کہا: "میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے۔"

اس کے بعد کی ایک غزل پر ایک مصرعہ کی اصلاح کی اور ایک شعر پہ دوبار صاد بنا دیا۔ اصلاح یہ تھی۔ مجاؔز کا شعر تھا:

قتل کر کے وہ مستیاں ان کی
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

فانی نے پہلا مصرعہ یوں بدل دیا

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

مجازؔ نے ہر بار اسے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا لونڈا پن دیکھئے لکھنوی انداز کا شعر کہا تھا جس شعر پر دو صاد بنائے تھے وہ یہ تھا

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرّہ کو آفتاب ہونا تھا

اس کے بعد تیسری بار اپنے زعم میں غالبؔ سے بھی دیا دہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ انھوں نے ایک نظر دیکھی اور کہا "کل آنا۔"

"ہم سمجھے کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ دوسرے دن گئے تو مطلع پڑھا

یوں مسکرائے رُخ سے اُٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

کہنے لگے "مہمل شعر ہے حضرت! آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں"
پھر کہا "تبسم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف؟"

"اس غزل کی اصلاح کے بعد ہم کمرے میں جاکر ایک گھنٹہ کے قریب خوب روئے اور فانی صاحب پر سخت خفا ہوئے۔ ان کی غزل پر غزل لکھی، راہ میں ملے تو طنز سے انہیں خوب جھک کر سلام کیا" "راستے سے گزر رہے تھے، مجاز کا مکان راہ میں تھا سلام کیا تو وہیں آ گئے۔

مجازؔ نے وہی غزل جو ان کی غزل پر لکھی تھی سُنائی بالکل خاموش بیٹھے رہے غزل ختم

ہوگئی تو کہنے لگے "میاں مجاز اس غزل کو ایک بار پھر پڑھنا۔"

مجاز نے کہا "یہ گویا میرے لئے سب سے بڑی دادِ تحسین تھی۔"

یہ غزل فانی کی غزل "ٹالے ہوتے تو ہیں" پر لکھی ہوئی تھی اور "آہنگ" میں شامل ہے، اس کا مطلع ہے ؎

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے ہیں

یہ مطلع مجاز کو پسند نہ تھا اور بڑی مشکل سے "آہنگ" کی تکمیل تدوین کے وقت اسے شامل کرنے پر راضی ہوئے تھے۔

آخری غزل جو مجاز نے فانی کو دکھائی تھی اس پر فانی نے کہا "میاں! تمہاری غزلوں میں نشاط کا رنگ ہے میرا غم تمہاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا اس لئے آئندہ مجھے اصلاح نہ لیا کرو۔ صرف الفاظ اور ترکیبوں کا اشتباہ دور کر لیا کرو یا ایک آدھ مصرعہ سُنا دیا کرو۔" اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوا۔

فانی کا ایک اور قصہ بھی سُنایا۔

بھوپال کے مشاعرے میں جو نواب صاحب بھوپال کی سالگرہ کے موقع پر ہوا تھا اتفاق سے فانی بھی موجود تھے اور جوش بھی۔ رات کو نواب صاحب نے ڈنر دیا اور اس کے بعد شراب کا دور چلا سب لوگ نشے میں بدمست تھے۔ جوش صاحب میں فقیر محمد خاں گویا کی روح بیدار ہوئی کہنے لگے:

"فانی صاحب! یہ نواب بھوپال بھی پٹھان ہیں اور میں بھی آفریدی ہوں۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ یہ آج نواب بھوپال بنے بیٹھے ہیں اور میں ایک فاقہ کش فقیر ان کی شراب پی رہا ہوں۔ ورنہ میرے پردادا نے ان کے پردادا کے ٹونک، جھانسی اور بندھیل کھنڈ کے میدانوں میں چھکے چھڑا دیئے تھے۔"

سناٹا چھا گیا۔

فانی صاحب نے جوش صاحب کو خاموش کرایا۔ "جوش صاحب! جوش صاحب! چپ ہو جائیے۔ پرانی تاریخ دہرانے سے کیا فائدہ؟"

جمعرات ۱۶ مارچ

حضرت گنج میں مجاز ملے اسی حالت میں۔

آج بھی پیسے کا تقاضا۔ آج بھی سلوراسٹون میں بیئر پیتے رہے اور قصے سناتے رہے وہ شعر سنایا جو لکھنؤ کے ہندی اخبار "نوجیون" کے ہولی نمبر کے لئے لکھا ہے ۔

ہندو مسلم سکھ عیسائی امن کے موتی رولیں گے
خون کی ہولی کھیل چکے ہیں اب یہ دھبے دھولیں گے

آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اپنی ملازمت کے قصے سناتے رہے۔ جب ملازمت سے معطل کر دیئے گئے تھے تو دو مہینے کے قرضے کی رقم سات سو روپے تک ہو گئی تھی اسی زمانے میں سب سے پہلی مرتبہ مجاز کے شراب پینے کی اطلاع گھر والوں تک پہنچی۔ اسی زمانے میں مجاز جس فلیٹ میں رہتے تھے اس کے نیچے والے حصے میں ایک نرس مس نوراسنگھ رہتی تھی جو ہسپتال میں کام نہیں کرتی تھی بلکہ پرائیویٹ نرس کی طرح کام کرتی تھی۔ اس نے مجاز کی شراب نوشی کو روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ "یہ بوتلیں وہسکی کی تمہارے لئے ہیں لیکن اس کا عہد کرو کہ ہمارے ہی گھر پر پیو گے اور باہر کہیں نہیں پیو گے۔" اسی زمانے میں "آوارہ" لکھی گئی۔

ڈاکٹر سید حسین مرحوم کے قصے سناتے رہے اور بڑی عقیدت کے ساتھ۔ جب ڈاکٹر سید حسین امریکہ سے جلاوطنی سے واپس آئے تھے اور بمبئی میں احمد عباس اور مجاز اپنے بھائی انصار ہروانی کے ساتھ ان سے ملنے گئے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی ملاقات کا ذکر کرتے

تھے۔ اسی زمانے میں مجازؔ نے سید حسین مرحوم پر "ایک جلا وطن کی واپسی" نظم لکھی تھی اور احمد عباس سے تذکرہ کرنے پر بھی سید حسین نے اس نظم کے سننے کا اشتیاق مجازؔ سے ظاہر نہیں کیا۔

جمعرات ۳ مارچ

مجازؔ کی دیوانگی حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ ملا صاحب نے ذریاد کی، سرورؔ صاحب الگ شاکی ہیں انہوں نے چائے پر بلایا تھا وہاں ان کی طرف سے نہ جانے کس کس کو مدعو کر آئے کوئی بیگم بشیر ہیں ان کو بھی بلا آئے ہیں۔ سرورؔ صاحب کی بیگم صاحبہ سے کہلا بھیجا کہ چھ سات مہمانوں کے لئے چائے وغیرہ کا انتظام کر رکھیں چائے کی پارٹی میں بھی کافی ہنگامہ کیا عیاذ ان کو پہنچانے گئے تو کہہ دیا کہ "اگر اس چوراہے سے آگے بڑھو گے تو اینٹیں ماروں گا"

۱/۲ ۵ بجے صبح مجھے ملے مجنوں گورکھپوری سے ملنے ساگل ہوٹل جا رہے تھے تم بھی ساتھ چلو میں نے کہا: "اتنے سویرے کہاں جایئے گا" بولے: "وہ صبح ۵ بجے اُٹھ جاتے ہیں اسے تم نے کوئی گھٹیا آدمی سمجھا ہے؟"

اس سے پہلے میرے یہاں آئے تھے اور ایک نہایت پُرترنگ بندی کر کے لائے تھے "کنگال کر دیا ہم کو۔ نیپال کر دیا ہم کو" وغیرہ۔ وہ کسی ایسے شخص کو سنائی جو یہاں برف خانے میں کام کرتے تھے اور ان سے کہا کہ "یہ تین شعر کیسے ہیں تین روپیہ کے ہوئے یا نہیں؟"

اس نے کہا: "انتہائی گھٹیا ہیں۔"

کہنے لگے: "ہم تو آگرے میں فانیؔ کے زیرِ سایہ رہتے تھے البتہ ہمارا ایک اور دوست گھٹیا مئو میں رہتا تھا۔"

جمعرات ۱۰ اپریل

منیشن نرائن سکسینہ آئے ہیں۔ کلکتہ کی امن کانفرنس سے واپس آ رہے ہیں۔ سُنا ہے مجاز بھی وہاں وارد ہوئے اور گھڑی گھڑی بیئر کی بوتلیں خرید کر لاتے تھے اور پیتے تھے نئے نئے لڑکے اور طلبا انہیں پلاتے تھے۔ کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں کے اجتماع میں مائیکروفون پر قبضہ جما کر کھڑے ہو گئے اس سے کچھ ہی دیر قبل سردار جعفری نے انگریزی میں تقریر کی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے کے لئے استعمال کیا تھا اور کسی دوسرے شاعر نے کہیں "رنگین آنکھیں" اور "غزال رنگیں" کی ترکیبیں استعمال کی تھیں، مجاز نے انگریزی میں تقریر شروع کی۔ جملے کچھ اس طرح کے تھے۔

"I am supposed to be a fairly important poet in India and Pakistan Put together but what is' one and a half hour' I fail to understand. I have also never come across 'TECHNICOLOR' eyes or a TECHNICOLOR CHIZAL. These people know niether ENGLISH nor URDU."

آج کل برملا کہتے ہیں کہ شاعر صرف دو ہیں ایک فیضؔ اور دوسرا مجازؔ۔

جوشؔ صاحب سے سخت ناراض ہیں۔

آغا حشر ٹائپ کے ڈراموں کے مکالمے بولتے ہیں اور بار بار دُہراتے ہیں،

"جہاں پناہ! ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے۔"

"ناشاد و نامراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے۔"

پھر شعر پڑھیں گے ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریف بوئے مشک غزالوں کے سامنے

"بس ہو چکے بہانے چلو تھانے۔"

دوشنبہ ۱۲ مئی

آج میں نے یہاں کے انگریزی روزنامے کے آرٹ اور فلم سیکشن کا کام سنبھال لیا۔ آج شام چیتن آنند کی فلم "آندھیاں" ریلیز ہوئی اس سلسلے میں دیو آنند، مشہور ہندوستانی اداکار اور نوکیتن کی پوری ٹیم آئی ہوئی ہے جس میں ان کا فوٹو گرافر جال مستری اور موسیقار علی اکبر خان بھی شامل ہیں ان لوگوں کے ساتھ شام گزری۔

رات کو رائل ہوٹل میں ڈنر تھا، شراب تھی، حسن تھا، عمدہ کھانے تھے۔ اور دیو آنند پر مرکوز سارے فلم پرستوں کی توجہ تھی۔ عزت، شہرت اور امارت کے اس نظارے سے عجیب احساس ہوا کہ یہ شخص جو دستاوسکی، زولا اور سرت چندر کا نام لیتا ہے ہزاروں میں کھیلتا ہے اور لاکھوں انسانوں کی بھیڑ سے چوروں کی طرح گھبرا کر بچ کر نکلتا ہے ایک سمت سے۔

—— اور اسی شام مجاز کے راچی پاگل خانے میں داخل ہونے کی خبر سنی اور کس المیہ انداز میں۔ انصار ہردانی انہیں یہ کہہ کر لے گئے کہ راچی میں مشاعرہ ہو رہا ہے اور پاگل خانہ پہنچ کر انہیں بتایا کہ مشاعرہ گرمی کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ مجاز انصار کو بھی اپنی نظم سنانے پر مصر تھے جنہیں انہوں نے زندگی بھر کبھی کوئی شعر نہیں سنایا۔ کہنے لگے "بھئی عجیب لوگ ہیں جنہوں نے گرمی کی وجہ سے مشاعرہ ملتوی کر دیا۔ گرمی کی وجہ سے کبھی مشاعرہ ملتوی ہوتے نہیں سنا۔"

اور وہ شاعرِ شراب حسن و شباب کا وہ مطرب نے نواز، پاگل خانے کی چار دیواری

میں قید ہوگیا۔ ابھی کچھ روز ہوئے میں نے کسی کا بے حد گندہ افسانہ نما مضمون پڑھا تھا۔ جس میں مجاز کے پاگل پن کا بھی مذاق اُڑایا گیا تھا اور کیچڑ اچھالی گئی تھی۔

کیا ہماری ادبی اور فنی دنیا کا یہی آئین ہے کہ ہر ایک فن کار پاگل خانے کی اندھی دیواروں کے بیچ دفن کر دیا جائے اور دنیا ہنستی رہے، قہقہے مارتی رہے، قہقہے لگاتے لگاتے پاگل ہو جائے۔

پتہ چلا ہے کہ مجاز کے برابر والے وارڈ میں قاضی نذرالاسلام ہیں۔ یہ ہے ہماری ادبی شہرت اور فنی برگزیدگی کی انتہا، تہذیب اور علم دوستی کی معراج ——— ع

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

حمیدہ سالم

جگن بھیّا

مجاز میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اس کی زندگی امنگوں، حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور خرمیوں، مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی۔ وہ زندگی کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا اور اس کی اپنی زندگی دھیرے دھیرے تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا۔ اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں مستقبل کو سنوارنے کی اُمنگیں ہیں۔ جوانی کی جولانی ہے۔ تجربہ کی ہوشمندی ہے شوریدہ سری ہے حسن ہے نفاست ہے۔ سادگی ہے پرکاری ہے اور زندگی نے اسے پریشانیاں دیں۔ پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں۔ بے چینی دی۔ وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا۔ مسرت مانگتا رہا۔ سکون چاہتا رہا اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی گئی۔ یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خون دل سے سینچنے والے شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی۔

مجاز کی زندگی اور مجاز کی شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتیوں کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مجاز اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں پیدا ہوئے یہ خاندان اور قصبہ جس میں مجاز نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے ردولی کی تمام تر آبادی زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں

بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بلند تھی۔ وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا، خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ میں وضعداری میں۔ خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے۔ پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں اعتقاد تھا۔ رسم و رواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصے بٹنے لازمی تھے یہ ڈھانچہ زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا آخر کو بیٹھ گیا اور آج رودولی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ اور اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجاز کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اپنے بچپن کی ہر یاد انہیں بہت عزیز تھی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں جب کبھی اماں ان کے بچپن کی رودولی کا ذکر چھیڑتیں وہ بہت دلچسپی سے اس میں حصہ لیتے۔ ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر رودولی جایا کرتے تھے لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے انہیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دکھ تھا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین گو کہ تھے متوسط درجہ کے زمیندار لیکن اپنی سمجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے ان کے سات اولادیں تھیں۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب کے سب ذہین اور ہوشیار۔ یہاں تک کہ معاملہ فہمی کارگزاری میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبہ میں اب تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا سوال تھا مسجد کے مکتب تھے اور کھاتا پیتا خاندان گھر میں مولوی رکھتا تھا۔ غرضیکہ عربی، فارسی کی تعلیم اور حساب سے اتنی واقفیت کہ زمینداری کا پیشہ کامیابی سے چلایا جا سکے یہ تھا معیار۔ دادا کی دو اولادیں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور ذرا غیر معمولی سی طبیعتیں رکھتی تھیں۔ ایک تو میرے چچا بے خبر، مدہوش، رنگین مزاج اور آزاد منش۔ دوسرے میرے والد سنجیدہ، بردبار، کم سخن، متقی اور مرنجان قسم کے انسان

طبیعت پر تصوف پرستی کا رنگ غالب دادا کو ان دونوں ہی کی طرف سے پریشانی تھی یہ چچا تو قابو میں نہ آسکے۔ باپ کی زندگی میں چھپ چھپ کر بعد میں کھلم کھلا جائداد کی پائی پائی بیچ کر خوب رنگ رلیاں منائیں۔ میرے والد دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا دیئے گئے چودہ برس کی عمر میں چچا زاد بہن سے شادی کی گئی۔ لیکن ان کی علم دوستی میں فرق نہ آیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایک تعلقدار گھرانے میں فیض آباد سے آئے ہوئے ایک بڑے انگریزی داں استاد رکھے گئے۔ والد نے ان سے استفادہ کیا اور زیادہ تر اپنی لگن کی وجہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا قصبہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ دادا کی بھی ہمت بڑھی۔ والد لکھنؤ بھیجے گئے اور کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی مدد سے تعلیم کا انتظام ہوا۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی تک کی نوبت آئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی نوبت آئی۔ ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے زمینداری کے باوجود کسی دوسرے پیشے کو اپنایا۔ غرضیکہ مجازؔ اس ابھرتے ہوتے خاندان میں پیدا ہوتے جو ایک طرف تو پرانی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا۔ اس خصوصیت کی جھلک مجازؔ کی شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی۔ ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل ان پڑھ تیز، ذہین زمانہ شناس، فطرتاً شوقین مزاج، تفریح پسند، پر جذباتیت کا رنگ غالب، مجازؔ کی شخصیت میں ماں باپ دونوں کا ملا جلا رنگ تھا۔ باپ کی طرف سے نیک نیتی۔ کم سخنی حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی۔ ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی زود حسی۔ اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔ کاش ان کے حصے میں باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ۔ استقلال۔ ارادے کی مضبوطی اور عاقبت اندیشی ملی ہوتی۔ لیکن ان کی زندگی کو تو یوں بکھرنا تھا۔ زمانہ کو تو حالات کے ہاتھوں فنکار کی موت کے تماشے دیکھنے تھے ان کی طبیعت میں وہ مضبوطی نہ تھی جو ان کے دل و دماغ کی نزاکت کو ڈھال بن کر محفوظ رکھ سکتی۔

مجازؔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان سے

بڑا ایک بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہو چکا تھا اس لئے بہت لاڈ اور منت مرادوں میں پالے گئے۔ عرم کی ساتویں کو فقیر بنتے۔ دسویں کو پاپک بنائے جاتے ایک کان میں بُندا پڑا ہوا تھا جو چھ سال کی عمر میں امیر لے جا کر اتارا گیا۔ ہر دکھ بیماری پر صدقہ اترتے تو خیراتیں ہوتیں۔ نو دس سال کے تھے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ ماں اور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حوادث و خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں۔ مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر اکیلے قدم نکالیں۔ ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آخر تک کوئی صبح ایسی نہ گزری جب ماں نے ان کی زندگی کے لئے دو رکعت شکرانہ کی ادا نہ کی ہوں۔ اب سے کچھ ہی سال پہلے تک روزانہ رات کو ان کے سرہانے دو آنے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دیئے جاتے۔ غرضیکہ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ حسرتیں اور آرزوئیں۔ بچپن ہی سے ہم سب نے یہ محسوس کیا گویا ماں کی زندگی کا مقصد وہی ہوں۔ ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں ان کی طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ ان کی اپنی طبیعت کی سادگی معصومیت اور خلوص تھا۔ جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں کبھی پیدا نہ ہوئی۔ ماں نے ان کی پرورش میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں اور آنے والی مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ان کی عرفیت جگن اسی بنا پر پڑی کہ بچپن سے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی کسے معلوم تھا کہ بچپن کی یہ شب بیداری اور بے چینی آخر عمر تک ان کا ساتھ دے گی۔

جگن بھیا بچپن سے بلا کے شریر اور بے خبر تھے۔ بہنوں کو چھیڑنا۔ بھائی سے لڑنا۔ سب کے مٹھائی کے حصے چھپ چھپ کر کھا لینا۔ کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے اندر کی ماہیت معلوم کرنا۔ گلی ڈنڈا اور دھول دھپا۔ یہ تھے ان کے محبوب مشغلے۔ آپا میری بڑی تھیں۔ سو ان سے ڈرتے تھے اور ان کے رعب میں رہتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی بہن سے زیادہ

ماں کا ساتھا۔ صفیہ آپا اور انصار بھائی سے ان کا اوپر تلے کا سا معاملہ تھا۔ بچپن میں ان تینوں کی ایک منٹ تو نہ بنی۔ صفیہ آپا کی گڑیوں کی چٹیا پکڑ کر نچانے میں انہیں خاص لطف ملتا تھا۔ غرضیکہ ہر وقت ان تینوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے تھے یہ فیصلہ زیادہ تر جگن بھیا ہی کے حق میں ہوتا تھا۔ کیونکہ ابا کے علاوہ کوئی بھی تو غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ نہیں دیتا تھا۔ جگن بھیا سب ہی کے لاڈلے تھے اور ابا ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر لکھنؤ رہتے تھے۔ جب تعطیلوں میں آتے تو جگن بھیا کا رنگ ہی بدلا ہوا ہوتا۔ ابا کا ایک مسلک روایتی ادب و لحاظ انہوں نے اپنی عمر کے آخری لمحہ تک کیا۔ دیوانگی کے دور بھی گزرے لیکن ابا کے سامنے انہوں نے کبھی سگریٹ نہ پی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی کلام بھی نہیں سناتے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ میری طرف ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ دوسروں کی مٹھائی چراتے اور مجھے کھلاتے، میری پرورش میں ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ ماں کے بعد میں ان سے ہی مانوس تھی۔ ہر وقت ان سے چمٹی رہتی میرا نام بھی ان ہی کا رکھا ہوا ہے اس کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ ہے جگن بھیا بچپن ہی سے بہت حسن پرست تھے۔ کوئی خوبصورت بیوی دیکھ لیتے بس دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دلہن بیاہ کر ردولی آئیں۔ ان کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا۔ جانے محض چاہت میں یا اس امید پر کہ شاید نام ہی کی لاج میں خوبصورت نکل جاؤں۔ میں اکثر ان سے لڑتی تھی کہ چہرہ کی خوبصورتی الگ رہی مجھے نام کی خوبصورتی سے بھی محروم کر ڈالا۔ گھسا پٹا نام رکھ دیا۔ ہنستے تھے اور کہتے تھے ارے پگلی خوبصورتی کہیں ناک آنکھ کی ہوتی ہے۔ اصل خوبصورتی تو دل کی ہوتی ہے جو چہرہ پر دمکتی ہے۔ میں پانچ سال کی تھی کہ مجھے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں

سے لد گیا ایسے عالم میں جو گھناؤنا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ ہو ہی سکتا ہے کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی۔ ابا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا بند کر رکھا تھا لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس پہنچ جاتے۔ میرے دانوں پر نیم کی پتیوں سے کھجلی کرتے مجھے کہانیاں سناتے لیٹے سناتے آخر کو انہیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا۔ طبیعت میں کتنا خلوص تھا کیسی ہمدردی جو وہ میرے گھناؤنے قرب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دے پاتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی تیمارداری کا ان میں بڑا ہنر تھا۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انہیں کے سر ہوتی اور خاندان کا یہ بے خبر اور لاابالی بچہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔

جگن بھیا کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جس کی وجہ سے وہ سب کو عزیز تھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں ملکیت کا احساس بچہ کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھے۔ دوسروں کی چیز اپنے تصرف میں لے آنا اپنی چیز دوسروں کو دے دینا ان کی عادت رہی۔ گھر کے نوکروں چاکروں سے ان کے بھائی برادری کے تعلقات تھے۔ ایک گھر کے پلے ہوئے نوکر شرف الدین سے ان کی بہت گہری پٹتی تھی۔ وہ ان کے گلی ڈنڈے کا ساتھی تھا۔ جوان ہو کر اس نے دوسری جگہ نوکریاں کیں لیکن وہ اکثر بڑے بھیا کے پاس ملنے آیا کرتا۔ غرضیکہ بچپن ہی سے وہ کچھ غیر معمولی سے تھے۔ ایک کان کچھ خراب رہتا تھا۔ اس لئے ذرا اونچا سنتے تھے۔ میرے ایک ماموں انہیں "بہرے اُو" کہتے تھے۔ ایک چچا انہیں "سڑے اُو" اور کچھ سنکی۔ یہ نام سولہ سترہ برس کی عمر تک رائج رہے۔ یہاں تک کہ ماں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ اب لڑکا جوان ہوا ہے اسے سڑی سنکی کہنا مناسب نہیں۔

شوخ۔ شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے۔ پڑھائی میں

ہوشیار اور حساب میں خاص طور پر بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار رہا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے اور ماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی ہر وقت مشق ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوئے ہوں گے پلنگ کھڑے کر کرکے ان پر سے کودتے تھے غرض کہ گھر میں ہم سب کے لئے ہر وقت وہ تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے رہتے۔

پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی سلیقہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم میں انہوں نے بہت دلچسپی لی۔ صفیہ آپا کو انگریزی انہوں نے ہی شروع کروائی۔ میری تو درس و تدریس کی تمام ذمہ داری انہیں کے سر تھی اس سلسلے میں ایک واقعہ کی یاد کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ پڑھنے میں میرا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لئے آئے ہوں گے اور میں الف زبر آ اور ب زبر با سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جانے میں غائب کر دیتی تھی یا غائب ہو جاتے تھے۔ میری تمام دلچسپی گڑیوں، ہنڈکلیوں یا پھر سہیلیوں کے ساتھ محلے بھر میں گھومنے میں تھی۔ ایک دن استانی جی نے بالکل مایوس ہو کر ماں سے میری شکایت کر دی۔ ماں نے مجھے بلا کر بہت ہی رقت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ نہ میری شکل نہ صورت آخر پڑھوں گی نہیں تو پھر کہاں کھپوں گی تصور بہت خوفناک تھا میں نے رونا شروع کر دیا۔ جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے فوراً اٹھے اور ردی کے صندوق سے ایک بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے۔ استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کروا کر مجھے خود پڑھانا شروع کر دیا۔ اس دن سے میں چل نکلی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی بندھن۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اس دن سے پڑھائی میں بددلی اور بدشوقی ختم ہو گئی۔ جس وقت تک میرا اسکول میں داخلہ نہ ہوا وہی مجھے پڑھاتے رہے۔ اردو، انگریزی، حساب، سب ہی کچھ ان کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے

مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا پڑھوا کر سنتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن اسے بھی فطرت کی ستم ظریفی ہی سمجھئے میرا رجحان ان کے مذاق سے بالکل برعکس رہا۔ بی۔ اے کے بعد ان کا اصرار تھا کہ میں اردو لوں۔ لیکن مجھے اپنے ادبی مذاق کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ سو میں نے معاشیات کا انتخاب کیا۔ جگن بھیا کو اس وقت مجھ سے خاصی مایوسی ہوئی۔

غرضیکہ جگن بھیا نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ ان کا شمار ہونہار نوجوانوں میں ہوا۔ جائداد تھی۔ گھر تھا باپ سرکاری ملازم تھے شکل و صورت بھی تھی صحت تھی۔ کیا کمی تھی۔ ہر لڑکی والے کی نظر ان پر تھی۔ شادی کی باتیں شروع ہوئیں۔ نانی کی خواہش تھی کہ دلہن کم عمر ہو۔ ماں کی تمنا تھی کہ بہو خوبصورت ہو۔ بہنوں کی آرزو تھی کہ بھاوج پڑھی لکھی ہو۔ باپ نے کہا کہ بیٹا جب تک تعلیم ختم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو شادی کا کوئی سوال نہیں۔ ماں اور نانی دباؤ میں آکر چپ ہو گئیں۔ بہنوں نے بات کی بات کا وزن محسوس کیا اور معاملہ دب گیا۔ جن لوگوں کے دلوں میں جگن بھیا کو داماد بنانے کی آرزو تھی ان کے دلوں میں رنجش نے جگہ لی۔ رویہ اور رجحان بدلنے لگے۔ جگن بھیا کی رنگین مزاجی۔ ہم عمر لڑکیوں اور بھاوجوں سے چھیڑ چھاڑ جو ان کے حسن اخلاق کی دلیل سمجھی جاتی تھی اب ان کی آوارگی کی دلیل سمجھی جانے لگی۔ ان کے لاابالی پن کا جو ان کی معصومیت کا ثبوت سمجھی جاتی تھی۔ غیر ذمہ داری میں شمار ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے عیب جوئی اور نکتہ چینی کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا اور خاندان کا یہ محبوب نوجوان محض شرابی کی صورت اختیار کر کے رہ گیا۔

جگن بھیا کی بالکل ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ میٹرک انھوں نے امین آباد اسکول لکھنؤ سے کیا۔ اسی زمانہ میں ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا۔ ۱۹۲۹ میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینئرنگ کی لائن اختیار کرنے کے خیال سے ریاضی کا مضامین میں انتخاب ہوا۔ آگرہ میں پڑوس فانی کا ملا اور کالج میں جذبی بھائی کا ساتھ ہوا۔ طبیعت کا فطری رجحان جو اب تک اپنے کمرے کے پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے۔ بچوں کو

ڈرائنگ بنا کر دیتے۔ دیوالی پر میرے لئے گھروندا سجانے اور اچھی اچھی صورتیں دیکھ کر خوش ہونے پر مطمئن تھا۔ ابھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈنے پر مائل ہوا۔ شاعری کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں ہم لوگ انہیں بورڈنگ میں چھوڑ کر علی گڑھ آ گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا۔ وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ وقفہ حیران پریشان ٹھٹک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونا شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا۔ وہ بھی حساب کا۔ کیمسٹری کا۔ گھر والے پریشان ہو اٹھے۔ انہیں علی گڑھ لے آئے۔ مضامین بدلے گئے۔ فلسفہ، معاشیات اور اردو کا انتخاب ہوا۔ دو سال حاضریاں پوری نہ ہو سکنے کے سبب امتحان نہ دے سکے۔ اللہ اللہ کر کے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ایم اے میں داخلہ لیا۔ پرانی روایتوں کے خلاف پریویس کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ داخلہ کے ایک دو مہینہ کے بعد دلی ریڈیو اسٹیشن سے 'آواز' کی سب ایڈیٹری کی جگہ نکلی۔ سبھی خواہوں نے مشورہ دیا کہ جگہ اچھی ہے۔ مذاق کے مطابق ہے۔ موقعے بار بار نہیں آتے۔ درخواست دی اور لے لئے گئے۔ علی گڑھ کا دور جگن بھیا کی ادبی زندگی اور سیاسی و سماجی شعور کا روشن ترین دور ہے۔ زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانے میں کہیں۔ سردار بھائی سبط بھائی۔ بھائی اختر اور جگن بھیا کا ایک گروپ تھا۔ یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ انہیں بھلا نہیں سکتی۔ کوئی اچھا مقرر تھا تو کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے اور نئی قدروں کو زندہ رکھنے میں منہمک تھے۔ علی گڑھ میں ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا ایک نئی زندگی ابھر رہی تھی۔ لیکن مقرر کبھی کبھی اپنی زبان درازی سے دوسروں کو تکلیف پہنچا جاتا ہے۔ ادیب کے قلم کی تیزی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ لیکن شاعر —— وہ تو دلوں کا رازداں ہوتا ہے۔

وہ تو روح کا پیامبر ہوتا ہے اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے اس کا پیام سچا ہوتا ہے پھر مجاز۔ جس کے یہاں شمشیر کی صلاحیت اور ساز و جام کا گداز دونوں ہی ہیں۔ جس کے دل میں باغی کی آگ جس کی رگوں میں جوانی کا جوش۔ جس کے گلے میں نغمہ بلبل کا وفور تھا۔ جس نے انقلاب کے نعرے لگانے کے بجائے انقلاب کے راگ گائے۔ جس نے علی گڑھ کو اپنا چمن قرار دیا اور ایسا چمن جہاں سے

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

ع تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ع ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

یہ بلبل اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا۔ استادوں کا منظورِ نظر طلباء کے لئے مایۂ ناز۔ عورت کو نکتہ داں بنانے والا شاعر لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر اس بلبل کے راگ تھے۔ مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں اس کا قد کتنا اچھا ہے وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے کسی سے محبت تو نہیں کرتا۔ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔

مجاز بحیثیت ۱۹۳۶ء میں دہلی گئے اور تقریباً ایک سال تک "آواز" کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ملازمت کے زمانہ میں گھر کا ایک پرانا ملازم عاشق علی ان کے ساتھ تھا جو سیاہ سفید کا مالک تھا۔ پہلی کو تنخواہ اس کے حوالے کرتے اور پلٹ کر نہ پوچھتے کہ کب اور کیسے صرف ہوئی۔ ان کا گھر مہمانوں اور ٹھہرنے والوں کی وجہ سے ہمیشہ کیمپوں کی شکل اختیار کئے رہتا۔ گھرداری کے سلسلے میں جتنی بھی چیزیں خریدیں سب میں خوش مذاقی کا لحاظ ضرور رکھتے تھے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے شراب کی عادت تھی ہی۔ ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں

اور بھی چمکی۔ لیکن اس وقت تک مجاز، شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں، تھا۔ اس کی زندگی، عرق شراب تند و تیز، نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک علی گڑھ کا شاعر تھا۔ دلی کا شرابی نہ تھا۔ بہر حال ریڈیو اسٹیشن کی اندرونی پالٹیکس اور یوپی اور پنجاب والوں کی رسہ کشی نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جگن بھیا ملازمت ترک کر کے یہ کہتے ہوئے دلی سے رخصت ہوتے ہو۔

رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں۔
جاتے جاتے تجھ سے اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزم سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
تیری اس بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں ماں بہنیں چاند سی دلہن لانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ تلاش جاری تھی۔ انتظامات ہو رہے تھے۔ یہاں تک نادنوں مراثنوں کے لئے جوڑے۔ پرجوں کے لئے لہنگے۔ کرتیاں۔ پاسیوں کے لئے شال دوشالے خریدے گئے تھے اور بس صرف چاند سی دلہن کا انتظار تھا کسے معلوم تھا کہ جگن بھیا کی زندگی کا یہ افق ہمیشہ ہی ابر آلود رہے گا۔ یہ چاند کبھی نہ نکلے گا۔ ماں کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔ بہنوں کی آرزوئیں کبھی بر نہ آئیں گی۔ انسان کی ضرورت تشنہ ہی رہے گی۔ شاعر کا تصور کاغذی ہی پیکر پہنے رہے گا۔ جگن بھیا وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شاعر سے عقیدت رکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے بہت محبت کی جا سکتی ہے۔ پر شادی تو نہیں پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے تو نہیں۔

دلی کے قیام کے دوران جگن بھیا کے دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم ان کی زندگی میں کبھی نہ بھر سکا۔ مراثم اور بچانے کا ذکر کیا۔ اس پہ مزید چوٹیں لگتی رہیں اور

دھیرے دھیرے ان کا پورا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ ان کے اپنے لئے، گھر والوں کے لئے اور سماج کے لئے انہوں نے محبت کی ایسی گہری چوٹ کھائی آخر لمحہ تک ان کے دم کے ساتھ رہی۔ لیکن قسمت دیکھو ہاتھ بھی بڑھایا تو شجر ممنوعہ کی طرف — دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی — چنچل، البیلی اور خوبصورت۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی عیش وعشرت کی عادی۔ ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک جو کچھ بھی سمجھئے۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر۔ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیرتا رہے۔ سر پر پھولوں کی بارش کرتا رہے اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا خواہشمند ہو تو سودا مہنگا تو نہیں شاعر بھی اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ ؂

میرا نغمہ باعث دلداری خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاطِ جاں تو ہے

لیکن برا ہو اس سماج کا۔ اس کی پڑوسی تر چھی سخت نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا۔ ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی آہ کا ذکر کیا شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا کہنا کیا گھٹ کر رہ گیا بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔

یاس کا دھواں اٹھا ہر نولئے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی ہر ربط شکستہ سے

بظاہر تو اتنا ہی ہوا لیکن قرب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سنگ کر رہ گیا اور سنگتے سنگتے ۱۹۳۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا۔ نروس بریک ڈاؤن کا یہ حملہ تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی اور لکھنؤ ہی میں تھی۔ صبح سے شام تک اخبار سناتے سناتے یا پھر شیلے اور کیٹس کے ٹکڑے سناتے سناتے میری زبان خشک ہو جاتی تھی۔ ایک لمحہ کی خاموشی گوارا نہ تھی۔ ایسا لگتا جیسے اندر شعلے اٹھ رہے ہوں جنہیں باتوں کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش ہو۔ بس یہ خبط تھا

کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا۔ جنت میں ناکامی کا انجام پورے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ علاج معالجہ ہوا چار مہینے کے لئے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے اور خدا خدا کر کے تندرست و توانا ہو کر واپس آئے اور پھر نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں سے واپس آئے تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانہ میں نئے ادب، اور اس کے بعد 'پرچم' کی ادارت کرتے رہے جب سب ساتھی اِدھر اُدھر بکھر گئے تو پھر دہلی واپس گئے اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ پر کام کرنا شروع کیا۔ ماں بہنوں نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا صفیہ آپا کی دوستوں میں سے ایک کو جگن بھیا سے کچھ ہمدردی اور کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کچھ غیر مطمئن بھی تھیں۔ صفیہ آپا کی تحریک پر انہوں نے جگن بھیا کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے نہ حسینوں میں شمار ہو سکتا تھا اور نہ بدصورتوں میں پڑھی لکھی تھیں۔ برسرروزگار تھیں لیکن طبیعتاً گھریلو قسم کی تھیں۔ جگن بھیا سے محض صفیہ آپا کے توسط سے بس ایک دو دفعہ کی ملاقات تھی۔ دل کے ملاپ کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن جگن بھیا نے سوچا کہ شاید سپردگی ہی میں نجات ہو اور زندگی کے منتشر تاریک جا ہو سکیں۔ زخم رضا بند کر دے۔ جذبات کا تو دل میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ جانے کس دل سے اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہرحال اس رشتے پر راضی ہو گئے اور بات ماں تک پہنچی کہ ایک دفعہ کے سرپرست سے مل لیں۔ اور معاملہ طے ہو جائے اس زمانہ میں جگن بھیا دلی لائبریری میں کام کر رہے تھے وہاں سے بلائے گئے اور بردکھوے کے لئے سفر پر روانہ ہوئے لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی جائے اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذب نظر لگنے کی کوشش ہو۔ لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار

کمانے والے کالج کے پرنسپل کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ ہر مہینہ پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش نہ پیدا ہو سکی خالی ہاتھ لوٹا دیئے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بجا یا بہت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا ــــ معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدیدار۔ دوسری طرف دل شکستہ خالی جیب والا شاعر۔ زر کی جیت ہوئی۔ فن پھر شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھائے تھے اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا پھر بھی ٹھوکر کھا گیا اور کھیکھ رو پڑا۔ تدبیر کے پائے سنگین پہ تقدیر نہ جھک سکی اور شاعر پر ۱۹۴۵ء میں دوسرا دیوانگی کا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا اور غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوشش اور جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں آ ہی آ گئے۔ لیکن زندگی کا ڈھرہ تو بدل نہ سکا۔ بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی۔ زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں اور وہ ان تلخیوں کو غرق مے ناب کرتے رہے۔ غرضیکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس جال میں جگن بھیا کی زندگی، وجود سب ہی کچھ الجھ کر رہ گیا لوگوں نے کہا مجاز کا علاج شادی۔ پر یہ علاج ہوتا تو کیونکر۔ مجاز کی جیبیں خالی تھیں۔ جہاں بھی گھر والوں نے ہاتھ پھیلایا جواب ملا بڑے کے ساتھ تو نہیں البتہ چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کر لو۔ وہی مجاز جو کبھی اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا کوڑا کرکٹ بن کر رہ گیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ان مایوسیوں کو جگن بھیا سے چھپائے رکھ سکیں لیکن انہیں اندازہ ہو ہی جاتا اور سوائے اس کے کہ ان کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی کسی طرح بھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں۔ ماں بہنوں کی ہمت نے جواب دے دیا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ایک طرف تو منہ توڑ جواب کا ڈر۔ دوسری طرف جگن بھیا کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ تجربہ یہ ہو چکا تھا کہ جنسی بھوک خواہ

کتنی شدید کیوں نہ رہی ہو۔عورت کی پرکھ ان میں ختم نہ ہوئی تھی۔صرف دیوانگی کے عالم میں ایسا ہوا کہ یہ بھوک پوری طرح سے ان پر حاوی اور یہ پرکھ ختم ہوئی۔ماں کے ایک قریبی عزیز نے اپنی لڑکی کے لئے منظوری دے دی تھی۔نیت کا حال خدا جانے۔جانے ماں کی مایوسی اور پریشان حالی سے متاثر ہو کر یا جگن بھیا کی برباد حالی پر رحم کھا کر یا پھر انہیں سمجھ بوجھ کر اور ان کی قدر شناسی کے طور پر بہر حال وہ راضی تھے۔جگن بھیا سے پوچھا گیا۔کافی عرصہ تک ٹالا کئے۔اپنے دل کو ٹٹولتے رہے اور آخر کو ماں سے کہہ ہی دیا کہ ماں اس لڑکی میں میں کوئی کشش نہیں پاتا۔اس کی قسمت پھوڑنے پر آپ کیوں تلی ہیں۔یہ اپنی قسم کا ان کی زندگی میں دوسرا واقعہ تھا۔ایک واقعہ علی گڑھ میں ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعہ سے ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا جواب جگن بھیا نے یہ دیا تھا۔ "صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے دلچسپی نہیں" نفس مضمون دونوں جوابوں کا ایک ہے۔ لیکن جن حالتوں میں دیئے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ان کا پہلا جواب اس وقت کا تھا جب وہ فلک شاعری پر ابھر رہے تھے۔ان کے سامنے ترقی کا میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا۔امیدوں کے رنگ آمیز پرچم لہرا رہے تھے اس لئے اس جواب کو تکبر اور خودسری کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے۔لیکن ان کا دوسرا جواب اس وقت کا ہے جب وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے۔در در سے ٹھکرائے جا چکے تھے جنسی تشنگی کا شکار تھے لیکن اس حالت میں بھی عورت سے زیادہ عورت کا تصور انہیں عزیز رہا۔اس جواب میں ایثار ہے۔شعور ہے کردار کی بلندی ہے۔بہر حال جگن بھیا کو ایک ساتھی نہ مل سکا جو ان کے دل کی آواز کو سمجھ سکتا ان کو سہارا دے سکتا۔جس کی ڈھارس سے وہ زندگی کی تھکن دور کر سکتے انہیں رفاقت نصیب تھی۔ تو وہ شراب کی۔وہی ان کا واحد سہارا تھی۔اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے ہیں او جھل سی ہو گئی۔ان کے چہرے کی تابانی پر دھیرے دھیرے بے بستی

U-10978l

کا پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی دمک کی جگہ اتھاہ گہرائی نے لے لی۔ جس میں امیدیں۔ آرزوئیں دفن ہوں۔ یاس و محرومی جھانک رہی ہو۔ کس غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں اور کیا کچھ پوشیدہ تھا ان میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے ان میں اُبھرنے کی خواہش باقی نہ ہو۔ غرضیکہ سمٹ سکڑ کر بقول عصمت آپا کے وہ بالکل نکھٹو رہ گئے۔ ایسا جو شرابی ہو اور شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اس کا بھی ہوش نہ رہتا ہو کہ کتنی پی رہا ہے۔ اور کیسی پی رہا ہے میں نے اکثر چاہا کہ ان سے منت کروں التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھالیں لیکن جب بھی میں نے ارادہ کیا میری ہمت جواب دے گئی آوارہ کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا کہ ماں کے آنسوؤں سے نہ پگھل سکے جس وقت ماں انہیں سمجھاتیں زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں۔ گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں۔ اپنی محبت باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتلاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ ان کے دل پر نشتر کی طرح لگتا ہے۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس الجھاوے میں تھے۔ جس سے اپنے کو نہ نکال پائے۔ غرضیکہ وہی شخص جیسا جو ہماری امیدوں آرزوؤں کا مرکز تھے پریشانیوں اور الجھنوں کا مرکز بن کر رہ گئے۔ کبھی ہم ان کی شراب نوشی اور خود فراموشی پر جھنجلاتے۔ تلخ ہوتے۔ جی چاہتا کہ انہیں اتنا جھنجھوڑیں کہ ان کے ہاتھ کے "فریب بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر" جھنجھنا کر ٹوٹ جائیں اور وہ چونک کر پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ کبھی جی چاہتا کہ ان سے چمٹ کر اتنا روئیں کہ ہمارے آنسو ان کے جمود کو بہالے جائیں اور وہ پھر یہ کہہ اٹھیں ؂

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایسا لگتا ہے جیسے ان کا عدم وجود سب برابر ہو۔ جیسے وہ ہمارے درمیان رہتے ہوئے بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوں جیسے وہ بہت دور خلاؤں میں گم ہو رہے ہوں۔ پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں کیا پوشیدہ ہے چوٹیں کھاتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔

پینتالیس سال کی عمر میں ایک دفعہ بھی تو ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی زندگی کی شکایت کی ہو یا کسی کا شکوہ کیا ہو۔ زندگی سے اتنی بے نیازی۔ تلخیاں جتنے عمر بیتی اور مزاج میں ذرا تلخی نہ پیدا ہوئی۔ کبھی تو کسی بات پر جھنجلا اُٹھتے بیزاری کا اظہار کرتے۔ سب کچھ خاموشی سے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۲ء میں تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور اس غضب کا شدید کہ خدا کی پناہ۔ گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دلی کے گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی جنسی محرومی کے تماشے دلی والوں نے خوب خوب دیکھے۔ جس انسان نے عالم ہوش میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا گھر والے ہر لحہ اس خبر کے منتظر تھے کہ مجاز موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دن ٹھہر کر۔ وہی ستر سالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جانماز پر بیٹھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی یا الہیٰ اسے اُٹھالے یا مجھے۔ جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔ دلی سے جوش صاحب کا خط آیا کہ مجاز کو آگرہ بھیج دیا جائے۔ مجاز اور آگرہ کا پاگل خانہ۔ دل پر کیسی چوٹ لگی۔ لیکن مجاز پاگل تھا۔ اس حقیقت سے کیونکر انکار ہوسکتا تھا۔ پاگل کو آخر کہاں تک اور کیسے بھگتا جاتا۔ جوش صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ کو استعمال کر کے رانچی میں جگہ دلوادیں۔ جوش صاحب کو خط ملا یا نہیں۔ بہرحال میں جواب کے انتظار ہی میں رہی ڈاکٹر ڈیوس رانچی ہسپتال کے انچارج سے براہ راست خط و کتابت کی۔ جگن بھیا کی لائف ہسٹری لکھ کر بھیجی شاید ان کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اس نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے ہی دیا۔ ورنہ ایسے ہسپتالوں میں بغیر سفارش کے جگہ کب ملتی ہے مجاز کو بمشکل رانچی بھیجا گیا۔ بوڑھے باپ نے اپنی پونجی کی آخری کوڑی انہیں بچانے کے لئے لگا دی اور چھ مہینے بعد وہ ٹھیک ہو کر آ گئے۔ ان کی واپسی کے ایک مہینے کے بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا۔ اس صدمہ کا اثر ان پر بجلی کے شاک سا ہوا۔ جیسے یک دم چونک پڑے ہوں۔ ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں

کا احساس چمکا۔ جادو اویس کی پڑھائی اور دیگر مشغلوں میں دلچسپی لینا ان کی دلجوئی کرنا۔ زیادہ تر وقت گھر پر گزارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز۔ رات کو جی بھر کر سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جادو اویس عشو عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دہرا رہا ہو۔ مگن بھیا پھر بیس پچیس سال پہلے والے مگن بھیا بن گئے ہوں۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا ان کی موت کو ان کی زندگی کا نقطۂ عروج بننا تھا انہیں تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کسے کہتے ہیں اور مر کر بھی کیسے جیا جا سکتا ہے غرض کہ چھ مہینہ تک مگن بھیا بالکل نارمل رہے۔ چاہنے والے ساتھی اور سچے دوست اپنے اپنے کام دھندوں میں اِدھر اُدھر لگے ہوئے تھے ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اُٹھانے والے ناسمجھ دوستوں اور ان کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے نادان ادب نوازوں نے انہیں پھر شراب خانہ کی طرف رجوع کروانا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد ان کے قدم تیزی سے اس طرف اُٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آنا دن میں دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اُٹھنا۔ منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرنا تھوڑی دیر اخبار کے ورق اِدھر اُدھر پلٹنا۔ یہ تھا ان کا پروگرام۔ اس درمیان موقع پا کر ماں کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انہیں احساس دلائیں اور آئندہ کے لئے احتیاط پر آمادہ کریں۔ چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کشمکش برداشت سے باہر ہو جاتی تو اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے اور پھر سب بچوں کو یک جا کر کے ان کے ساتھ کھیل میں اپنے کو بھولنے کی کوشش کرتے۔ گھر میں ماشاءاللہ بچوں کی تعداد بہت طویل تھی سات عدد بچے تھے۔ دو صفیہ آپا کے۔ دو میرے اور تین میرے بھانجے کے۔ ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عرفی انہیں عزیز تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ اس کا بچپن بالکل مگن بھیا جیسا ہے۔ بہت شریر اور بے خبر۔ اس سے خود

کو استاد کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے تب کھانا کھاتے وہ اپنی گندی گندی انگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹی کی چھین جھپٹ کیا کرتا۔ آخر کو آدھی آدھی پر معاملہ طے ہوتا۔ خود بھی بہت گندے طریقے پر کھانا کھاتے۔ چاول میں دال سالن ملا کر انگلیاں اس قدر تیزی سے چلاتے گویا کسی ساز پر چل رہی ہوں۔ یہاں تک کہ پیٹ میں پھین سا پیدا ہو جاتا تب منہ میں لقمہ لے جاتے۔ منہ ذرا کم کھلتا تھا اس لئے کھاتے وقت ہمیشہ ایک قسم کی سڑکنے کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ سب بچے ان کو بچہ دادا کہتے تھے عالم ہوش میں بھی وہ ایک طرح کی خود فراموشی ان بچوں میں کھو کر حاصل کر لیتے تھے۔ شام ہوتی۔ کپڑے بدلتے۔ کپڑوں کی صفائی اور نفاست کا لحاظ ہر عالم میں رہا۔ تیسرے دن ضرور کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے۔ ایسا لگتا جیسے سوچ رہے ہوں کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہفتہ ہفتہ گھر سے نہ نکلتے لیکن آخر ایسے کب تک گزر ہوتی آخر کو چل ہی دیتے۔ شاید اس ارادے کے ساتھ کہ اب اپنے کو کھو کر واپس نہ آؤں گا۔ لیکن باہر جا کر ان کی قوت ارادی بالکل جواب دے جاتی اور پھر اسی بد حالی میں واپس آتے کبھی پیدل اور کبھی رکشا میں کھانا سگریٹ اور پان سمیت ان کے کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ یہ مدتوں پرانا معمول تھا۔ اگر کچھ ہوش میں ہوتے تو کھا لیتے ورنہ پھر صبح کھاتے۔ غرض کہ دن کو بیکاری اور رات کو شراب نوشی کا زہر گھن کی طرح ان کی زندگی کو گھلاتا رہا اور ہم سب یہ تماشہ دیکھتے رہے آخر ایک دن سب نے سن لیا کہ مجاز مر گیا۔ پتھروں پر سسک سسک کر ٹھنڈ میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر۔ یہ مجاز کی موت تھی۔ فن کار کی موت۔ شاعر کی موت۔ کہانی پوری ہوتی۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ پر ایسا کیوں ہوا۔ یہ خلش یہ ٹھٹھک ہر حساس دل و دماغ میں باقی رہ گئی۔

جاں نثار اختر

میرا دوست میرا مہمان

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے مجاز ان دنوں ہارڈنگ لائبریری میں کام کرتا تھا اور میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں لکچرار تھا۔ کالج میں ہر سال دسمبر کے مہینہ میں سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا لیکن بزم ادب کا فنڈ بہت ہی مختصر اور محدود تھا۔ اس لئے بیرونی شعراء میں سے ایک دو ہی کو مدعو کیا جاسکتا تھا۔ اس سال بزم ادب نے صرف مجاز کو بلانے کا فیصلہ کیا اور مجاز میرے خط کے بعد گوالیار آنے کے لئے مجبور ہوگیا۔

مجاز پہلی بار ہم لوگوں کے گھر آرہا تھا صفیہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ مجاز کو لینے خود اسٹیشن گئی مجھے دو دن سے بخار آرہا تھا اس نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجاز آئے اور گھر کی رونق میں دونا اضافہ ہوگیا۔ اس کے آتے ہی ہمارے گھر لوگوں کا جمگھٹا ہونے لگا مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ شہر کی کتنی ہی ادب نواز خواتین بھی اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لئے غیر متوقع طور پر ہمارے یہاں جمع ہوگئیں۔ مجاز کی شاعری میں جو لطیف رومانی عنصر ہے اس نے مجاز کو خواتین کے حلقہ میں ہمیشہ حد سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز رکھا ہے وہ خود کو اگر شاعر غم دنیا، مطرب بزم دلبراں، کہتا تھا تو اس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا۔

اسی شام کالج میں مشاعرہ تھا۔ میں کالج کے مشاعرہ میں بھی نہ جا سکا۔ میرے عزیز دوست اور ہندی کے مشہور کوی شیو منگل سنگھ سمن جو اس وقت کالج میں میرے ساتھی پروفیسروں میں سے تھے مجاز کو اپنے ساتھ کالج لے گئے۔ مشاعرہ ہوا اور بہت کامیاب رہا۔

دوسرے روز کوی سمیلن تھا۔ بھن شام ہی سے مجازؔ کو اپنے گھر لے گئے تھے وہاں ایسی محفل جمی کہ تقریباً ساڑھے دس بج گئے جس وقت مجازؔ اور بھنؔ کالج پہنچے۔ کالج کے لڑکے بطور احتجاج کوی سمیلن کے بائیکاٹ پر اتر آئے۔ بھنؔ نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن طلباء بے قابو ہو چکے تھے۔ آخر کار مجازؔ نے اٹھ کر ذاتی طور پر معذرت چاہی اور اس تاخیر کے الزام کو اپنے سر لے لیا اس نے کہا: آپ بے شک مجھے نہ سنئے گا جس کی وجہ سے آپ کو یہ تکلیف اٹھانی پڑی یہ FUNCTION آپ کا ہے آپ خود اس کا بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں" مجازؔ کے اس اخلاقی اقدام نے بجلی کا سا اثر کیا اور ساتھ ہی "آوارہ" "آوارہ" کے تقاضوں سے ہال گونجنے لگا اور ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ مجازؔ اپنے مترنم مگر ٹوٹے ہوئے لہجے میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی بات کہہ رہا تھا۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جو لوگ مجازؔ کو اس کی بے روزگاری کے لئے ہدف ملامت بناتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اس کی بے روزگاری کے پیچھے اس کی ناکام معاشی جدوجہد کی کتنی لمبی داستان چھپی ہوئی ہے۔ اس نے کئی ملازمتیں کیں۔ لیکن کوئی ملازمت اسے راس نہ آئی اور اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ اس نے کسی مجبوری مفاہمت کی آڑ لے کر اپنے ضمیر اور اپنی ترقی پسندی کو بیچنا گوارا نہیں کیا۔ تقریباً ڈھائی بجے رات کو کوی سمیلن ختم ہوا۔ کالج کے لڑکوں نے مجازؔ کو ہاتھوں پر اٹھا لیا اس رات کا ہیرو بھی مجازؔ ہی تھا۔

دوسرے دن ہم لوگ مجازؔ کو گوالیار کے تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لے گئے۔ گوالیار کا قلعہ، رانی جھانسی کا میموریل، تان سین کا مزار، میوزیم وغیرہ تان سین کے مزار پر مجازؔ، ماجد میاں اور ایوب مزار و جد بڑی دیر تک قوالی گاتے رہے۔ واپسی پر مجازؔ مجھ سے کہنے لگا۔ "اختر یہ تان سین کا مسلمان ہو جانا بے سبب نہیں اتنا بڑا آرٹسٹ محمد غوث کے بہکانے میں تو نہیں آسکتا"۔ لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ ایک غیر مستند روایت یہ بھی ہے کہ اس نے

کسی مسلمان لڑکی کے عشق میں اسلام قبول کر لیا تھا تو مجازؔ خوش ہو گیا اور کہنے لگا۔ بس یہی مستند باقی سب غیر مستند۔ پھر وہ رات بھر گنگناتا رہا۔

عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہو گیا

ہم لوگ گھر واپس ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ مجازؔ نے "آشا" کی فرمائش کی۔ یہ گوالیار کی خاص شراب ہے اپنے ذائقے اور نشے کے اعتبار سے بہت تیز و تند ہوتی ہے۔ دوسرے دن تو مجازؔ نے اسے "مئے مرد افگن" کا لقب دے دیا تھا۔ غرض کہ باہر کے کمرے میں محفل جمی، میرے دو ایک دوست بھی شریک تھے۔ کوئی دس بجے کے قریب سب کے رخصت ہونے کے بعد میں اور مجازؔ تنہا رہ گئے اس زمانے میں مجاز شراب کے بعد بھی خاموش سا رہنے لگا تھا لیکن اس رات اس نے نہ جانے کتنی باتیں مجھ سے کر ڈالیں عام طور پر مسلسل گفتگو مجازؔ کے بس کی بات نہ تھی لیکن آج وہ متواتر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک اکیلا ہی بولتا رہا۔ اسے اپنے بہت سے عزیز دوستوں سے شکایت تھی اسے اس "زہرہ جبیں" سے بھی شکوہ تھا جسے اُسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے پھر بھی وہ ایسا ضرور محسوس کرتا تھا کہ اسے جو محبت جواب میں ملنی چاہیئے اس میں کہیں کمی ضرور رہ گئی ہے۔ مجھ سے بڑے موثر لہجہ میں کہنے لگا "آخر میں چاہتا تھا کہ اپنے مجموعے کے کسی ایڈیشن کو اس کے نام منسوب کروں لیکن اس نے منظور نہیں کیا۔" میں نے اسے متاثر ہوتے دیکھ کر بات کا رخ موڑنا چاہا۔ میں نے کہا۔ لیکن یہ فیضؔ کے دیباچے کے نام جو تم نے آہنگ کا انتساب کیا ہے اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ تم فیضؔ ہی کے نام منسوب کر دیتے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ انتساب اس کا کیا ہوا نہیں۔ خود مکتبہ والوں کی ذہنی اپج ہے پھر وہ فیض کے بارے میں بہت سی پیاری باتیں کرتا رہا۔ اسے اپنے ہمعصروں میں فیضؔ اور جذبی سے بے حد پیار تھا۔ جذبیؔ سے اپنی کئی لڑائیاں بھی بیان کرتا رہا۔ پھر وہ خود میرے اور صفیہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا اپنے گھر میں اسے صفیہ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا صفیہ کو وہ بہت چاہتا تھا اور ساتھ ہی ذہنی

طور پر مرعوب بھی تھا۔ کرشن چندر نے زیرِ لب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اپنی سماجی سوجھ بوجھ میں اپنے اندازِ فکر میں اپنے محسوسات کی تنظیم و تربیت میں صفیہ مجاز سے بہت آگے تھی"۔ تو مجاز کو اس بات کا احساس ہی نہیں اعتراف بھی تھا۔ صفیہ کے مرنے پر جو خط اس نے سہیل عظیم آبادی کے نام لکھا ہے اور جو اتفاق سے پوسٹ کرنا بھول گیا تھا وہ اس کے کاغذات میں موجود ہے اس میں مجاز نے صفیہ کی موت پر لکھا ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہن ہمیشہ کے لئے سو گیا ہو۔ حد یہ تھی کہ مجاز نے کبھی صفیہ کے سامنے پی کر آنے کی ہمت نہیں کی لیکن اس رات وہ صفیہ کے متعلق بے تحاشا باتیں کرتے کرتے یہ بھول گیا کہ وہ بہت زیادہ نشے کے عالم میں ہے اور اس نے یکبارگی مجھ سے کہا۔ اختر صفیہ کو بلا لاؤ۔ میں نے اندر جا کر صفیہ سے کہا۔ مجاز تمہیں بلاتے ہیں۔ لیکن صفیہ تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا "اختر تم یقین کرو۔ میں نے کبھی اسرار بھائی کو اس عالم میں نہیں دیکھا ہے اور نہ میں انہیں اس عالم میں دیکھنے کی تاب رکھتی ہوں۔ یہ میری جذباتی کمزوری ہے پھر اگر میں اس وقت بالفرض چلی بھی جاؤں تو اسرار بھائی پر صبح اپنی اس جرأت کا برا رد عمل ہوگا اور وہ کل تو چلے ہی جائیں گے۔ لیکن شاید پھر کبھی میرے گھر آنے کی ان میں ہمت نہ رہے" میں نے صفیہ سے کوئی اصرار نہیں کیا اور باہر آکر مجاز سے صفیہ کی کمزوری بیان کر دی۔ صفیہ کے انکار پر مجاز نے بے قابو ہو کر رونا شروع کر دیا۔ میرے گلے میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ بڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ اُدھر صفیہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔ آخر اسی عالم میں مجاز بغیر کھانا کھائے بستر پر پڑ کے سو گیا اور صفیہ اس کے سرہانے اس کے سر پر ہاتھ رکھے رات بھر بیٹھی روتی رہی۔ صبح جب مجاز کی آنکھ کھلی تو صفیہ نے مجاز کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور دیر تک اس کے سینے میں منہ چھپائے روتی رہی مجھے نہیں معلوم مجاز نے صفیہ سے یا صفیہ نے مجاز سے کچھ کہا یا نہیں۔ کیونکہ میں اس کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔ اگر نہ چلا آتا تو خود میرے رو پڑنے میں کسر نہ رہ گئی تھی۔

مجاز کا ارادہ اس دن روانگی کا تھا لیکن صفیہ نے اسے ہرگز جانے کی اجازت نہ دی۔ دن بھر مجاز گھر ہی پہ رہے۔ ماجد میاں نے مجاز کے پیچھے پڑ کے اسے بیت بازی کے لئے راضی کر لیا۔ ماجد میاں، ایوب مرزا واجد اور مجاز ایک طرف ہو گئے اور میں تنہا ایک طرف۔ بیت بازی کے لئے موضوع کا انتخاب کیا گیا "آنکھ" اور یہ قید اٹھا دی گئی کہ فلاں حرف سے مصرع شروع ہو۔ البتہ شعر کے معیاری ہونے کی شرط تھی اور اس کے لئے صفیہ جج مقرر کر دی گئی۔ مجاز کو واجبی طور پہ شعر یاد تھے۔ اصل بیت بازی ماجد میاں سے ہوتی رہی مجاز ان کا سہارا لیتے رہے جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے بے تحاشہ شعر یاد ہیں غالباً ابن رشیق نے شاعر ہونے کے لئے ایک لاکھ شعر یاد ہونے کی قید بھی لگائی ہے اگر وہ کچھ زیادہ کی قید بھی لگاتا تو کم سے کم مجھے فکر نہ ہوتی۔ صفیہ کہا کرتی تھی کہ اختر تمہارا دماغ اس معاملہ میں "کباڑ خانہ" ہے اچھے بڑے الٹے سیدھے ہر طرح کے شعر تمہیں یاد کیسے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال تین چار گھنٹے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ ماجد میاں کا خزانہ ختم ہونے لگا اور مجاز نے شعر گھڑنا شروع کر دیئے۔ ظاہر ہے جلدی میں گھڑا ہوا شعر کیسے معیاری ہو۔ جہاں مجاز نے شعر دیا اور صفیہ نے "القط" کر دیا۔ نتیجے میں ماجد میاں اور مجاز کو مات ہوئی اور صفیہ نے دونوں سے لڑ جھگڑ کر سٹائی کے لئے پیسے وصول کر لئے۔

اس رات شراب کو محفل سے نکالا دے دیا گیا۔ اونگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں "دالی محفل تقریباً صبح تک ہی جمی رہی۔ نہ جانے کہاں کہاں کے دلچسپ قصے اور کتنے لطیفے مجاز نے سنا ڈالے ان میں ایک قصہ یہ بھی تھا کہ قلعہ ہاتھ میں دار فنڈ کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ تھا۔ خاصی تعداد میں شاعر آئے تھے۔ دوسری صبح چائے پی جا رہی تھی کہ تحصیلدار صاحب نے سب شاعروں کو بلوا بھیجا۔ خود ایک کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ برابر میں ایک لوہے کی تپائی پہ منشی جی بیٹھے تھے۔ جب شاعر جمع ہو گئے۔ تو تحصیلدار صاحب نے نام پکارنے کے لئے کہا۔ منشی جی نے شاعر کا نام پکارا۔ وہ آگے

بڑھا۔ تحصیلدار صاحب نے سوال کیا "آپ سے کیا رقم طے ہوئی تھی۔" وہ کچھ جھجکا یا تو انہوں نے ذرا ڈانٹ کر کہا "بتایئے کیا طے ہوا تھا" مجبوراً اسے بتانا پڑا "دو سو روپیہ تحصیلدار صاحب نے منشی جی کو حکم دیا "آپ کو صرف ایک سو ساٹھ روپیہ دیجئے" شاعر کچھ جزبز ہوا تو ارشاد ہوا "گڑبڑ نہ کیجئے، تشریف لے جایئے" غرض سب ہی کا یہ حشر ہوتا رہا۔ شعرا نے جائے قیام پر پہنچ کر بہت شور و غل مچایا۔ ابھی یہ شور و غل جاری تھا کہ تحصیلدار صاحب کے ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ ہاتھرس کی بس تیار ہے۔ سب "شعرا صاحبان" اسی بس سے چلے جائیں۔ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔

آج کا دن مجاز کی روانگی کا تھا مجاز کو کالج سے جو رقم ملنے والی تھی۔ صفیہ نے اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی دن تاکید کر دی تھی کہ اسرار بھائی کے پیسے انہیں بالکل نہیں دینا۔ تم مجھے لاکر دے دینا۔ چنانچہ میں نے اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ مجاز نے کالج کے پیسوں کا کوئی تقاضا ابھی تک مجھ سے نہیں کیا تھا لیکن آج اسے جانا تھا اور اس کے پاس غالباً کرایہ بھی نہ رہ گیا تھا چنانچہ دبی زبان سے اس نے مجھ سے کہا "اختر کالج سے اگر واپسی کا کرایہ مل جاتا تو اچھا تھا۔ میں نے کہا تمہارے پیسے صفیہ کے پاس رکھے ہیں وہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن چلتے وقت جب صفیہ نے اسے چالیس روپئے لاکر دیئے کہ یہ آپ کے ٹکٹ کے پیسے ہیں باقی کے میں نے آپ کے کپڑے سلوا کے آپ کے بکس میں رکھ دیئے ہیں۔ تو مجاز پہلے تو بہت جھنجھلایا کہنے لگا کپڑوں کی کیا ضرورت تھی میرے پاس ضرورت سے زیادہ کپڑے موجود ہیں، صفیہ نے کہا وہ تو مجھے پتہ ہے آپ کے پاس جتنے کپڑے ہوں گے" آخر میں مجاز کہنے لگا "تم بھی تحصیلدارنی سے کم نہیں ہو" اور ہم سب دیر تک رات کے سنے ہوئے قصہ کی روشنی میں اس فقرے کا لطف لیتے رہے۔ میں نے کہا چلو صبر کرو، زیادہ سے زیادہ اس طرح مشاعرہ میں تمہارے بھی چالیس روپے کٹے ہوں گے۔ سمجھو وہ یہاں مل گئے کہنے لگا "ان پیسوں کے بھی صفیہ نے جوتے

وغیرہ خرید دیئے ہوتے تو ہم کیا کر لیتے ؟"

آخر وہ لمحہ بھی آگیا، جب مجازؔ رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ صفیہ دیر تک اس سے بھی "ٹکو" سی رہی۔ مجازؔ نے اس کی مانگ پر پیار کیا اور اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے جادو کے لئے کھلونے خریدے اور مجھے دیئے کہ میں اسے دے دوں۔ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایوب نے آکر اطلاع دی کہ مجاز صاحب ٹرین آ رہی ہے۔ مجازؔ نے برجستہ کہا: "میں کیسے روک سکتا ہوں"۔ ٹرین آئی اور مجاز مجھ سے گلے مل کے روانہ ہو گیا۔ واپسی پہ گھر میں عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ اس شام میں اور صفیہ — مجازؔ ہی کی باتیں کرتے رہے۔ مجازؔ جو اس کا جان سے پیارا بھائی تھا اور میرا پچیس سال کا دوست اور آج جب نہ صفیہ باقی ہے نہ وہ گھر باقی ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ اس دل سے تو وہ میرا دوست وہ میرا مہمان کبھی نہ جا سکے گا۔

عصمت چغتائی

عشقِ مجازی

ایک نچی گھٹی شام تھی۔ لڑکیاں موسمی چھٹیاں گزارنے اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکی تھیں۔ صرف چند چھوٹے نصیبوں والی جن کے گھر دور تھے یا کوئی ہمسفر نہ ملا تھا ڈھنڈھا ہوسٹل میں سہمی ہوئی ابابیلوں کی طرح سرگرداں نظر آجایا کرتی تھیں لوگ سمجھتے ہیں یہ کالجوں کی آوارہ لڑکیاں بس دن رات عیش ہی کیا کرتی ہیں کوئی انہیں کیسے بتائے کہ کالج کی حقیقی عیاشی اسی زمانہ میں ہوتی ہے جب کہ پڑھائی ہو رہی ہو۔ ورنہ بے مصرف گزارنے والی چھٹیوں میں تو بورڈنگ میں بس پاگل خانے کا لطف آجاتا ہے۔

جب بدگویاں کرتے کرتے جبڑے دکھنے لگتے" اور ساری کہانیاں اور چٹکلے پھیکے پڑ جاتے اور سارے سیاہ اور سفید جھوٹ سڑ بس کر جی متلانے لگتا تو سوائے ہاتھی ڈباؤ چہار دیواری سے سر پھوڑنے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا دن تو کسی نہ کسی طرح زبردستی ہنسی کھیل میں گھسیٹ ڈالتے پر جوں ہی شام کا سرمئی سایہ صحن میں رینگنا شروع کرتا یکدم بولا اٹھتے اور نامعلوم سا دھیما دھیما خوف گلا دبوچنے لگتا۔ چپکے چپکے گنتی کی آٹھ دس لڑکیاں ایک دوسرے کے قریب کھسک آتیں۔ گھروں کی یاد دل میں سلگ اٹھتی اور بے اختیار سر جوڑ کر آنسو بہانے شروع کر دیئے جاتے۔ آنسو پونچھے جاتے اور پھر گھل مل کر جینے کی کوشش شروع ہو جاتی۔

جوں ہی شام پڑی سب کی سب کامن روم کی لمبی چوڑی دری گھسیٹ کر ٹینس کورٹ پر لے آئیں اور تکیے چادریں لگا کر ایک عام خواب گاہ تیار ہو گئی اور

شروع ہوگئی گپ بازی۔

گھر نہ جلسکے تو کیا، ذکر ہی سے منہ میٹھا کرنے لگے۔ پر جوں جوں گھروں کی باتیں ہوتیں جی اور زیادہ بوجھل اور اداس ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ گلے رندھ گئے اور خیالات کی ڈوریاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ سب ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ چاندنی کس قدر مردہ ہے یہ سائے صحن کے کونوں میں کتنے خاموش دبکے بیٹھے ہیں جو ایک دم سے جھپٹ پڑیں تو۔ اور غیر مری پرچھائیاں سی جو دماغ میں سرسرا رہی ہیں یہ اداسی کتنی بوجھل ہے۔ الو کی آواز میں کتنی سنگلی پوشیدہ ہے اور یہ ٹینس کورٹ پر لمبی لمبی لیٹی ہوئی لڑکیاں بالکل غمگین قبروں کی طرح معلوم ہو رہی ہیں۔ میں ایک بڑے سے بھیانک تابوت میں گھٹی ہوئی ہوں۔۔۔۔ آہ اماں نے مجھے گھر کیوں نہیں بلایا۔ انہیں ذرا بھی مجھ سے محبت نہیں تو کسی کو بھی مجھ سے محبت نہیں اور کسی کو نہیں معلوم کہ میں کتنی اکیلی ہوں؟

اور یہ سب لڑکیاں بھی یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ چار دن چھٹیوں کے گزر گئے چار اور گزر جائیں گے۔ پھر چار دن اور رہ جائیں گے اور یونہی یہ لمبے بیکار بے رنگ دن اور یہ تھکی تھکی شامیں یہ ان تھک رینگتی ہوئی قطار! اس ناامیدی اور غریب الوطنی کے احساس نے کچھ اس درجہ مجبوس کیا کہ بے اختیار آہیں نکل گئیں۔

"اب کے گرمیوں میں ماموں ابا کے پاس چلی جاؤں۔" اختر نے ترکیب سوچی۔

"اور ہم تو پہاڑ پر جایا ہی کرتے ہیں" رضیہ نے اطلاع دی۔

"کلیاں بڑی اچھی جگہ ہے" عالیہ ہمیشہ اڑتی تھی۔

مگر محمودہ؟ کالی آنکھوں، کالے بالوں اور کالی رنگت والی محمودہ؟ اس کا کیا ہوگا۔ جس کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ رشتہ دار بورڈنگ ہی اس کا گھر تھا وہی لمبا چوڑا مقبرے کی طرح سنسان ہوسٹل جہاں وہ چھٹیاں گزارا کرتی تھی۔ پھر گھٹن اور بڑھ گئی۔ خاموشی

گہری ہو گئی۔ ایک خلا سا دلوں میں پھیلنے لگا۔ اسی خلاء میں آواز آئی۔

"اے غم دل کیا کروں"

چونک کر، جو ہم نے دیکھا تو یہ چاکلیٹ جیسی سوندھی رنگت والی محمودہ تھی جو ہم سب سے دور دری کے کونے پر ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھے اپنی آنسو بھری آواز میں گنگنا رہی تھی۔

"۔۔۔۔۔۔۔اے وحشت دل کیا کروں"

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

کچھ سوتی ہوئی لڑکیوں کے سینے بکھر گئے تلملا کر اٹھ بیٹھیں محمودہ کی آواز جذبات کی فراوانی سے اور سہم گئی سی

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر تو ستارے ٹوٹنے لگے موتیوں کی لڑیاں ہنسلیں سے بکھر کر دوپٹوں میں الجھ گئیں۔ سینوں میں ہوکیں اٹھنے لگیں۔ لیکن جب شعلے بھڑک اٹھے، پیمانے چھلک پڑے اور سینوں کے زخم نمک اٹھے تو ڈرامہ شاعری کی حدوں سے گزر کر بھونڈے قسم کی بھوں بھوں میں پھسل آیا۔ وہ دھوم دھام کی صف ماتم بچھی کہ محرم ماند پڑ گئے۔ سرور سے گزر کر لٹا بازی پہ نوبت آپہنچی۔ نہایت غیر شاعرانہ قسم کی سوں سوں۔

ازحد عامیانہ اور بچکانی قسم لاحول ولاقوۃ۔

ایک ہنسی پھر دوسری اور سب کھل کھلا کر لوٹ گئیں۔

توبہ۔ مگر غصہ تو تمودہ چڑیل پر آیا اور اصل غصہ آیا اس چھوٹی سی کتاب پر جسے وہ آڑ میں چھپائے ہوئے تھی۔ جھپٹ مار کر کتاب کو قبضہ میں کرنا چاہا۔

تو بھی صیفہ اپنی کتاب، اس نے کتاب صیفہ پر کھینچ ماری۔ ایک کتاب کی دس بنتے بنتے رہ گئیں۔ جلدی جلدی لالٹین کی روشنی میں شاعر کا نام دیکھا۔

"ہائے تے" نفیس ناک والی نور بولی۔ "اسرار الحق!"

"چہ تو یہ کس قدر ڈھیل نام ہے"

"مگر مجاز؟ ...... ٹھیک ہی ہے۔"

"خاصہ ہے"

"چہ مہ...... کافی سوئٹ ہے جی۔"

تو یہ تھی وہ کتاب جس کا نام تھا "آہنگ" جس نے ہمیں ایسے بڑے موقعہ پر پکڑ کر الو بنا دیا...... بڑا جی کھسیانہ ہوا اور پھر لالٹینوں کی بتیاں اکسا اکسا کر وہ غم دل کی پوچھ گچھ کی گئی کہ توبہ بھلی۔ پتلی سی کتاب ایک روپیہ قیمت۔ عیدی۔ بقرعیدی نمائش کے پیسوں سے چھ چھ سات سات کاپیاں خرید ڈالیں تحفے میں تو "آہنگ" نقد ادھار عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں "آہنگ" چل پڑی۔ جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے کونے میں سر جوڑے کبھی "اندھیری رات کے مسافر" کے ساتھ دشت پیمائی کر رہی ہیں۔ تو کبھی بربط شکستہ کے تار سلجھائے جا رہے ہیں۔ دو "نذروں" لئے بیٹھی ہیں تو چار "خانہ بدوش" کے ساتھ تو چند "رات اور ریل" کے ساتھ فراٹے بھر رہی ہیں تو کوئی بھولی بھٹکی غمگین "کسی کی یاد میں" غرق منادعائے پڑی ہے کسی طرف "انقلاب" لایا جا رہا ہے تو کہیں "غدار" پہ پھنکاریں برہ رہی ہیں۔ غرض دل و دماغ پر کچھ اس شان سے "آہنگ"

چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی وبا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے یہاں تک کہ کان پک گئے سنتے سنتے جی متلا اٹھے۔

"اچھا تو یہ ہے، تم تو مرجاؤ اس پہ جا کر۔"

"پڑھنا لکھنا چھوڑو جی۔ اس کے در پہ دھرنا دے دو بلکے"

"صفیہ سے کہو تمہاری شادی کرادے۔"

"واہ تم نہ کرنا شادی۔"

کڑوے کڑوے جملے چلتے جی جل جاتے اور منہ سوج جاتے۔

"یہ سب جنسی بھوک ہے۔ جہاں لڑکے کا نام سنا مر مٹیں"

نک پر عینک لگائے نجمہ بڑبڑاتیں "یہ ذہنی غلاظت"

یہ سمجھئے مذاق ختم جرم ثابت۔ مجرم سہم کر رہ گئے۔ ہونٹ ساکت ہو گئے۔ مگر دہاں زیاں یہاں کم بخت شاعر سے جان نہ پہچان سروکار ہی کب تھا۔ شاعری سے جو رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ قائم رہا۔ طعنوں طشنوں کی سنگ باری نہ توڑ سکی۔

اور جب اسی قسم کی اداس تنہائیاں بورڈنگ کی فضا کو گھیر لیتیں تو پھر غم دل ابھر آتا۔ محمودہ کی لرزتی ہوئی آواز ہوتی اور چمن کے خاموش کونے ایک دوسرے کے شانوں پر سر ٹک جاتے اور آنسوؤں کے بند کھل جاتے۔ یہی معلوم ہوتا کہ شعروں میں اپنا ہی دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ وہی جانے پہچانے دکھ۔ وہی پرانی آشنا الجھنیں۔ سب ہی کچھ تو تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اختر شیرانی کی سلمیٰ کی عمر کچھ ڈھل چلی تھی۔ حفیظ کچھ شاہی قسم کی شاعری پر تلے ہوئے تھے۔ جگر مرنے کی بات کہتے مگر کچھ پرانی وضع میں رہ گئے۔ جوش تو ان کی شاعری سے محظوظ ہونے سے زیادہ خوف آتا تھا وہ ان کے دبنگ الفاظ۔ دبنگ خیالات اور کچھ نادر شاہی قسم کے احکامات سن کر کچھ ہیبت بھی زیادہ طاری ہو جاتی تھی۔

مگر مجاز سے کچھ رشتہ داری سی محسوس ہونے لگی، جیسے ایک ہی قبیلے کے ہوں، بلکہ کچھ ایک ہی خاندان کے۔

پر نہ جانے کس کی نظر لگی کہ ڈوری کچھ ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی۔ سنا مجاز ریڈیو میں نوکر ہو گئے اور علی گڑھ بھر کی لڑکیوں کو سمیٹ سمیٹ کر تقریریں کروانے لے جایا کرتے ہیں اور پھر سنا نکال دیئے گئے ریڈیو اسٹیشن سے!

پھر سنا، کچھ نہیں کرتے۔

پھر سنا کچھ بھی نہیں کرتے۔

اور پھر سنا، اجی کچھ بھی تو نہیں کرتے!!!

لکھنؤ!

جب مجاز ریڈیو سے نکلے تو انہیں کچھ عجیب قسم کی چلیں جھپٹ لے گئیں۔ ایک طبقہ ہے ہندوستان میں جو صرف کھانے اور پینے کی اہم مہمات انجام دیا کرتا ہے۔ عرف عام میں اس طبقہ کو کھاتا پیتا طبقہ کہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے منچلے بھرے پڑے ہیں۔ اس طبقے کے نئے گھان نے باپ دادا کے آبائی پیشہ رنڈی بازی سے اکتا کر علم و ادب سے لطف لینا شروع کر دیا ہے اب ان کی محفل میں بجائے مغنی جان کے مجرے کے مشاعرے اور "ادبی جلسے" ہوتے ہیں۔ بجائے مرغ اور بیئر کے ادیب اور شاعر پلے جاتے ہیں۔

خدا جانے مجاز کس رشتہ سے پھنسے اور کس خوفناک پھنکی میں پیر اڑائے کہ جیتے جی مردوں میں گن لئے گئے۔ وہاں خدا جانے کیا کھایا اور کیا پیا کہ اونگھ ہی تو گئے۔

مجاز کچھ نازک قسم کے پودے کی طرح ہیں کہ کھلے باغ میں تازی ہوا صاف پانی ملے تو بہار ہی بہار! اور جو حماقت سے تھوڑا اور بھٹ کنی کے بیچ میں دامن الجھ جائیں تو سوکھ ساکھ کر ٹھونٹھ۔

اور پھر سنا کہ مجاز کے دماغ میں کچھ کیڑے رینگنے لگے ہیں، پھر وہ کیڑے بڑھ کر

ٹمر بچو بن گئے اور ماشاء اللہ سے مالیخولیا کے ابتدائی درجہ میں قدم رکھ دیا۔

اور پھر یہ سنا کہ خدا کے فضل سے ہو گئے پورے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اُٹھ! چلو چھٹی ہوئی۔ باپ گئا۔ ماں باپ کو بھی ذرا سا سکون ملا ہوگا۔ غریب دن رات ہول میں جیتے ہوں گے۔ اودھر ہردائی ہے کہ بلانے کی "غنڈوں" کے ساتھ مل کر اودھم مچا رہا ہے ادھر اس نے اوا اگلنا شروع کر دیا تھا۔ سو تو خیر سے وقت پہ ہی منہ پاٹ دیا گیا۔

جب چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور جب شاعر یا ادیب گنگ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے تو فی الحال مجازؔ بھی چل بسے!

"غم دل" "رد پیار" "دل کی دھڑکن" کھیا گئیں" "طفلی کے خواب" "سائے بن کر منڈلاتے ہوتے اور پھر مٹ گئے" "آہنگ کی دو چار کا پیاں ادھر اُدھر رلیں، میلی ہوئیں پھر کھو گئیں کون ڈھونڈے اونھ۔

مجاز کا راز کوئی چھپا ڈھکا نہیں۔ اس کے زمانے کے ہر نوجوان کی زندگی کے آئینہ میں جھانکئے اور مجازؔ کو دیکھ لیجئے اس کے ہر دکھ میں مجازؔ کے دکھ کا راز مل جائے گا۔ پھر بھی خود مجاز نے جو دیکھا وہ "ارباب نشاط" میں دکھا بھی دیا۔

بن گیا تھا یک بیک فردوس کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوانِ نشاط

اور وہاں جب

"بزم میں صونے گود میں فردوس رعنائی لیے" نظر آتے تو بے اختیار شاعر پر اپنی زندگی کا صحیح معرفت واضح ہو گیا اور اس نے سوچا چلو اور کچھ نہیں پھر بھی اتنا تو سہارا ملا کہ

میرا نغمہ باعثِ دلداریٔ خوباں تو ہے
میرا رونا خیر سے وجہ نشاطِ جاں تو ہے

اور اس سے زیادہ کی ہوس بھی بیکار تھی۔ داد بھی ملی اور بے داد بھی مگر ذاتی بپتی

اُس باندھی تھی۔ محفل خوباں میں شاعر کو تو جی بھر کے داد ملی پر وہ ناکارہ انسان جو اس کی پشت کے پیچھے چھپا ساتھ چلا آیا تھا۔ خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا۔ شاعر نے "واہ" کی آرزو کی، وہ مل گئی۔ انسان نے "آہ" کی تمنا کی، وہ نہ ملی۔

اور جب انسان کی ہار ہوتی تو شاعر بھی کھسیا کر رو پڑا۔

مجاز کی زندگی کی طرح ان کی صورت شکل بھی کچھ الجھی الجھی سی ہے لفظوں میں نقش و نگار کو ڈھالنا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا ہوا میں دائرے کھینچنے کی کوشش کرنا تاثرات کی چہرے پر وہ بھاگ مچی ہے کہ نقش و نگار بگڑ کے کچھ بن کر رہ گئے۔ آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ از حد مشکل ہے کہ ان کی تہہ میں کیا ڈوبا ہوا ہے ایک مبہم سی یاس و ناامیدی۔ مگر ساتھ ساتھ کچھ بنانے کا ارمان، بگڑ جانے کا حوصلہ، کچھ الجھنیں اور پریشانیاں جو آج کل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر رہ گئی ہیں۔

اور ایک ناک جو ستواں کی حدوں سے کب کی گزر چکی ہے جس کی ہڈی شاید بڑھ رہی ہے اور چہرہ چھوٹا پڑتا جا رہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علمبردار ہے۔ مجاز عجیب قسم کا بزدل ہے۔ ویسے تو قلم کے بل بوتے پر وہ خون کی آندھیاں چلا سکتا ہے۔ سرخ طوفان لا سکتا ہے لیکن اگر آپ اس کے سامنے ایک ننھی سی چوہیا کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کھردری سڑک پر گھسیٹیں تو وہ رو پڑے گا۔ پچھلے دنوں جب ملک میں فسادات اور جیتے جیتے خون کی ہولی کھیلی گئی تو وہ دماغی طور پر سہم کر کونے میں دبک گیا۔ دنیا کو ایک رشتے میں بندھا ہوا دیکھنے کی آرزومند آنکھوں سے جب انسانی کھوپڑیاں سڑک پر پتھروں سے ناریل کی طرح پھوٹتی دیکھیں تو اس کی روح تک لرز اٹھی وہ کئی گھنٹے بے ہوش رہا اور دنوں منہ میں نوالہ نہ ڈال سکا۔

ناک نقشے کے حساب سے ہاتھ پیر بھی ہیں بال جی بھر کے ملے ہیں جن کے ایک کنارے پر کسی زمانے میں سفید کھدر کی ایک ٹوپی اس طرح معلق رہا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا

تھا کہ اب گری! اور اب گری اور شاید غریب کہیں گر پڑی اور اس کی جگہ بالوں والی چائے پوشی سے ملتی جلتی کیپ نے لے لی۔ لیکن وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اُڑا لے گئیں اور آج کل جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پر کوئی شے نہیں سما رہے۔

ویسے میں مجاز کو بہت کم جانتی ہوں۔ میرا مطلب ہے میں اصل مجاز سے زیادہ انہیں ان کی شاعری میں ڈھونڈ کر پاتی رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میری ملاقات ان کی شاعری سے ہوئی اور پھر جب میں خود شاعر سے ملی تو میں نے انہیں وہی سمجھا جو شعار نے بتایا تھا۔ میں نے مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانے کے تمام مجاز ہی دیکھے اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا نہیں وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اُٹھا اور خوب اُٹھا۔ پر نہ جانے منہ کے بل کیوں آ رہا۔

جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اڑان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقعہ پھسل پڑے تھے کہ توبہ بھلی یعنی بالکل شجر ممنوعہ قسم کی عجوبہ پر پھسل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کے باعث عشق کے میدان میں تو اترتے آئی مگر بزنس کے معاملے میں رہ گئی۔

اور بھئی ہے بھی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے۔ پر قاضی اندھے نہیں ہوتے خیر تو نہ جانے کیا بیتی۔ چہرے کی بجھی بجھی سی چنگاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی چہ! یہ نوجوان!

ویسے تو آسمان سے ستارے نوچ لائیں گے۔ اجی ایک نہیں "سارے کے سارے" تخت سلطان تو کیا سارا قطرِ سلطان پھونک دینے کی دھمکی دیں گے یعنی کہ پورے قیس مار خاں، لیکن جو ذرا میدان عشق میں تنکا بھی لگ گیا تو چت، فوراً لمبے لمبے لیٹ جائیں گے اور کریں بھی کیا بچارے صدیوں کی روائتیں اور افسانے یہی تو سکھاتے ہیں کہ دنیا میں عشق کے سوا اور سب فضول ہے۔ زندگی کا پہلا اور آخری مقصد یہی تو ہے کہ جھٹ

پٹ موقع بے موقع کسی کے عشق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر کامیاب ہو گئے تو سر باندھ کر گھوڑے پر چڑھو۔ پھر بھوکوں ننگوں کی تعداد بڑھانے پر ٹوٹ پڑو اگر ناکام رہے تو پھر کیا فکر ہے۔ پاگل ہو جاؤ۔ مزے سے برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔

خیر جی کون کہتا ہے عشق نہ کرو۔ جوانی اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مگر آج کے نوجوان تو عشق بھی سلیقے سے کرنا نہیں جانتے۔ پہلے زمانہ میں تو لوگ عشق کیا کرتے تھے۔ اور بس کئے چلے جاتے تھے پر آج کل کے عاشق کچھ عجیب قسم کی معجون ہیں کہ مرض عشق ہی میں مبتلا ہیں یا اور ہزاروں روگ ہیں جنہیں عشق کی آڑ میں چھپا رکھا ہے اور مجاز جو کہ بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ہندوستان کے اس درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کے نمائندے ہیں جو زندگی کے سارے جھمیلوں بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشم کشا کر رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کانٹے چبھتے ہیں اور ان کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے یہ لوگ کیا جانیں۔ سلیقہ کا عشق کرنا کون جانے وہ عشق ہی تھا یا دنیا وی گورکھ کے خلاف جہاد مجاز کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکا ہوش آتے ہی مورچہ بندی شروع ہو گئی ہو گی پہلی جنگ تو خود اپنے گھر کی گورنمنٹ سے خود اپنے جائز حقوق کے لئے تھی۔ بہنوں کو علیگڑھ اکر اسکول بھجوانا، ان کی شادیاں کہاں، کیوں اور کیسے ہوتی ہیں، اس کا سوچ بچار کرنا اگر اس اولے سے محاذ پر پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ سمجھئے کہ آنے والی ساری فتوحات بھیانک شکستیں ہی نظر آئیں گی بھلا جب اپنے ہی گھر میں بائے تنے ہوئے ہیں تو دوسروں کے گھر میں کس منہ سے جھاڑو دے کر جائیں، مگر خوش قسمتی سے مجاز کے والدین ان گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو منہ کا نوالہ روک کر بچوں کو تعلیم دلا دیتے ہیں۔

دوسرا محاذ کالج اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف قائم ہوتا ہے جہاں آج بیرانہ تو کل رسٹی کیشن پر نوبت پہنچی ہوئی ہے۔ چال ڈھال پہ بندش، اور جب زندگی میں یوں چاروں طرف سے ٹانگ گھسیٹی جا رہی ہو تو کوئی کیا عشق کرے اور کیا عاشقانہ شاعری،

HaSnain Sialvi

وہ زمانے تو لد گئے جب شاعر مزے سے عشق کرتے تھے اور شاعری کرتے تھے اور اب تو عشق کی گردن میں پولیس کا ڈنڈا اٹکا ہے۔ ہاتھ روٹی کمانے میں الجھے ہوئے ہیں۔ پیر غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں ایک نہیں سو ہزار آسیب جان کو چمٹے ہوئے ہیں اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھلانے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں شاعری بجائے داستان حسن و عشق کے معجون مرکب نہ بن جائے تو اور کیا کرے یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق و دنیا بستہ باہم کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں بھلا زندگی میں جب اتنی مجبوریاں ہوں تو کوئی کیونکر جیئے۔ ایسی صورت میں ع

کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا، بھلے ہی دن نہ تھے؟ ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ ع

لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں

پھر بھی مجبوریاں اور لاچاریاں نصیب ہی گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہوگی۔ منہ پر ایک طمانچہ سا لگا۔

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں

اور اب کہ......

یہی تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں
مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے
دوسرے پاٹک ایک خونیں راگ بن کر ہونگا

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجاز کو واقعی یہ معاملہ عشق ہی ہوا تھا یا یہ بھی اس کا وہی خواب تھا جو آج کل کا بیشتر نوجوان سوتے جاگتے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے پر تعبیر نہیں ملتی وہ گھر میں گوشت پوست کی چاند سی دلہن ہی لانا چاہتا ہے یا دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی سے ڈھالنے کی خواہش کو دلہن کا روپ دے دیا ہے اس کا عشق تو کچھ اس بری طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے کہ وہ اسے جدا نہیں کر سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی گھر بھی چاند سی دلہن کے پر نور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا جب تک ملک پر سے یہ بھیانک بھوک نہ مٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخسار کی تابانیوں کا نغمہ بھی گاتا ہے اور ان گھنگھور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رخ روشن پر چھائی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے چاروں طرف لٹکتے ہوئے وزنی تالے اس کی سانس گھونٹے دیتے ہیں دانت پیس پیس کر وہ ان پر ٹھوڑے سے مارتا ہے۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں اسی واضح اور ابھری ہوئی نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بے حد انوکھا اور اصول شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا بلکہ اس کے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے اور چند انداز جو وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا کہ اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے، سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے اور پھر میں سوچتی ہوں کہ بھی یہ شاعر تو بڑے ترقی پسند ہوں گے مگر بے چارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ نہ کہہ پاتے ہوں گے بڑوں کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

"میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے" اس دنیا کی عورت جسے آپ چلتا

پھر تا ہوں دیکھتے ہیں، یہی نہیں مجازؔ نے عورت کو پہلی بار عورت نہیں کہا بلکہ اسے نکتہ دان بھی بنا دیا حسن کے ساتھ ساتھ "مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی" اور بجائے خون دل پلانے اور لخت جگر کھلانے کے اچھی خاصی آدمیت کی باتیں کرتی ہے اور.....

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں

لیکن یہ کیا کہ

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

لاحول ولا قوۃ! کہیں یہ سب کچھ مجازؔ کے شاعرانہ دماغ کا واہمہ تو نہیں اور یہ جیتی جاگتی عورت، جسے میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہیں اس کی یہ تمنا تو نہیں جسے وجود میں لانے کی آرزو میں یہ ساری جستجو ہے۔ جس کے بغیر خود اس کا وجود ادھورا اور حیران ہے جس کے انتظار میں وہ اور اس کا وطن غلامی کی بیڑیاں پہنے گھلتے رہتے ہیں جیسے وہ چیخ چیخ کر پکار رہا ہے کہ

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر جی نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے تخیل سے کہہ رہا ہے، "نوجوان خاتون" بھولی نہیں عورت ہے جو شمع حرم یا گھر کی رونق ہی نہیں بلکہ ایک ساتھی ہے جو زندگی کی دوڑ میں کندھوں پر سوار نہیں بلکہ نصف بوجھ کاندھوں پر لئے قدم بہ قدم ساتھ ہے جس کا مقصد زندگی تجالوں میں جینا تجالوں میں مرنا نہیں ہے۔

عام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کر دے تو اس کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے۔ وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے اس میں وہ نسوانیت

اور لطافت نہیں رہی۔ مجاز کی رائے میں حسین شے خواہ باہر رکھو یا اندر حسین ہی رہے گی بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے جہاں عورتیں تعلیم یافتہ بھی ہیں دنیا کے کاموں میں حصہ بھی لے رہی ہیں اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہوئیں اور واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں جو تعلیم کا اثر ہوا تھا وہ بہت کچھ اس مغالطہ میں ڈالنے والا تھا جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور رنڈی کا پیشہ اختیار کرنا ایک ہی درجہ کا جرم سمجھا جاتا تھا، اس زمانہ میں جو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو نہایت پاکباز اور مقدس ظاہر کرنے کے لئے بالکل ننوں کی سی زندگی گزارتی لیکن اب جب کہ تعلیم نسواں کا مسئلہ حل ہو ہی چکا اور لڑکیاں آزادی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں وہ بالکل غیر دلچسپ اور مردہ دل نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کی نسوانیت وغیرہ غائب ہوتی ہے وہ مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں اور لوازمات زینت سے بھی غافل نہیں رہتیں۔ عشق و عاشقی کو بھی گناہ نہیں سمجھتیں باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھا دیا ہے اور بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی التجا کہ

سنا تیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

خالی نہیں گئی عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پر مجھے تو تعجب ہے کہ جب مجاز نے پکارا کہ

آؤ مل کر انقلاب تازہ پیدا کریں

تو کسی نے لبیک نہ کہا، کسی نے اس کے بلاوے نہ سنے، اجی کون سنتا ہے ان بے جھنکار زیوتوں کو، کہنے والے کہتے ہیں، ہندوستان میں لڑکیوں کی افراط ہے، ہوگی شاید مگر صرف شادی کے

بازار میں جہاں گرانی کے مارے ایسے ویسے کا گزر نہیں۔ مال پڑے گھٹا کرتے ہیں ادھر خالی جیبوں والے منہ تکتے ہیں یا پھر پبلک مارکیٹ میں اڑن کٹولہ پر ٹکٹ لو اور ساتواں آسمان کی سیر کراؤ۔

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

ویسے میں نے خود سنت نازک کو رونا روتے سنا ہے کہ مرد انہیں آزادی نہیں دیتے اللہ جانے وہ آزادی کب ملے گی اور کون لاکر انہیں دے گا اور جب تک یونہی روتے روتے جائیں گے اور شاعر چیختے چیختے تھک جائیں گے اس سپاہی کی طرح جس کا ایک ہاتھ آزاد ہو اور دوسرا پیٹ کے پیچھے مروڑ کر باندھ دیا گیا ہو اور پیٹھ کے پیچھے مروڑا ہوا زخمی ہاتھ اسی طرح ناچاری سے کراہتا ہے کاش یہ ہاتھ اپنی انگلیوں کو ہلا کر دو چار گرہیں کھول دیتا تو پھر بہت سی گرہیں آپ سے آپ سرکتی چلی جاتیں۔

میں نے مجاز کو بہت قریب سے نہیں دیکھا اور دیکھا بھی صرف تین بار، لیکن تینوں بار زندگی کے تین مختلف موڑ پر۔ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں یہ مجاز کے عروج کا پرشور زمانہ تھا۔ جب نئی پود نے "آہنگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینہ سے لگایا تھا۔ جب مجاز کے نام پہ گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور جب کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں؟ اس زمانہ میں مجاز سے ملنے میں اور صفیہ اختر کے ٹھونٹھ بھرے کھیتوں میں اپنے گیت پھیلتے محمود صاحب کے یہاں پہنچے۔ ایک لق و دق کوٹ کے پھاٹک جیسے گریبان میں سے دو چنگاریاں سی کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں اور یہ مجاز تھے، حد سے زیادہ خاموش، کم سخن، کم نظر قسم کے انسان اور میں نے سوچا تھا کہ یہ شاعر سب گورکھ دھندا ہوتے ہیں، اندھیری رات میں ریل کی وہ جنوں انگیز دوڑ کا خالق آہستہ رو، چیونٹی جیسی چال، پر اب سوچتی ہوں کہ اگر مجاز کا نیا شاعر نہ ہوتے تو یقیناً ریل جیسی رفتار ہوتی اصول کہتے ہیں کہ یا تو جسم دوڑے یا دماغ اور

ابھی چند دن ہوئے میں نے وہ نظم پھر سے پڑھی۔ تو مجھے دور چٹانوں پر دندناتی ہوئی ریل صاف نظر آنے لگی۔ معہ اپنی تمام گرج اور دھوم کے پر دیکھتے ہی دیکھتے وہ فولادی پہیے پگھل کر صرف خیال کی ایک مبہم سی پرچھائیں رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا معلوم ہوا کہ یہ ریل نہ تھی بلکہ اس کی آڑ میں جاز کی وہ شوریدہ سر روح تھی وہ اس کا منچلا تصور جو طوفانی تیزی سے گرجتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے، ؎

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بے اختیار میرے دماغ میں گونج گیا اور میں نے کچھ کچھ اس کی خودسری کا اندازہ لگا لیا۔ اور دل کو دوڑا کر، اپنے تخیل کی لگام ڈھیل کر کے وہ اپنی قوت عمل کی بے تابیوں کو ڈھنڈا کر لیتا ہے وہ سوچتا ہے عمل کرنے والوں کے لئے اور خود وہ ساکت ہے بالکل خاموش پانی کی طرح ٹھہرا ہوا۔

جب محمود صاحب کے یہاں ملے تو بہت کم باتیں ہوتیں۔ صرف ایک مسئلہ پر چند سیکنڈ بحث کی۔ میں نے کہا "آپ بڑے قدامت پرست ہیں"۔

بولے "کیوں"۔

میں نے کہا "نرس کی چارہ گری۔ میں آپ نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ جب آپ نورا کے لبوں سے وہ لطیف شے چرا لیتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ زمانۂ قدیم کی معشوقاؤں کی طرح وہ شرما کر کچھ نخرہ کرے گی، بگڑے گی۔ پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو آپ کو وہ بے حیا معلوم دی، کیونکہ شمع حیا جسے آپ کی قدامت پرستی نے روشن رہنے دیا ہے۔ وہ جھلملا کر رہ گئی۔

بولے "شاید ایسا ہو مگر شرمانے میں لازم نہیں کہ قدامت پسندی کا خدشہ ہو"۔

میں نے کہا "شرمانے میں کوئی نقصان نہیں، پر جب اسے قدرتی طور پر شرم نہیں آئی تھی اور صرف آپ کی خاطر سے وہ شرما دیتی تو۔۔۔۔ یہ تو"۔

"لاحول ولا قوۃ، مکدر ہو کے بولے" یہ تو میں کبھی نہیں چاہتا تھا"

اس کے بعد سب نے ہنسنا شروع کر دیا لہذا بات ادھوری رہ گئی، اس کے بعد مجھے اور سبینہ کو پہنچانے مجاز اور محمود صاحب لالٹین لے کر آئے، پھاٹک پر مذاق فرمانے لگے کہ کبھی کسی روز ہمیں بھی مدعو کیجئے۔

ہم نے کہا "بڑے شوق سے مگر سر پہ توا باندھ کر آئیے گا جو کیدار کی لاٹھی میں لوہے کی شام لگی ہے"

بولے "یہ پہرہ آپ لوگوں پر کب تک رہے گا۔"

"جب تک آپ لوگ چاہیں۔"

"ہم لوگ" محمود صاحب بھی بگڑے۔

"غلطی ہوئی آپ لوگ سے میرا مطلب ہے آپ کے قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہمارے چال چلن کا پہرے دار سمجھتے ہیں۔"

"تو ان سے لڑیئے" مجاز نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ بوقت فرصت انشاء اللہ" ہم نے جواب دیا اور پھاٹک کے اندر غڑاپ ہو گئے۔

اور پھر چار پانچ سال گزر گئے کبھی کبھی اڑتی اڑاتی خبریں ملتی رہیں پھر ۴۳ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے یہ وہ زمانہ تھا مجاز کا ستارۂ شاعری ڈوب چکا تھا کچھ کچھ مقتدین کی صف کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا وہ تو کھاتا اتنا جمع ہو چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر پشت پہ "آہنگ" نہ ہوتی تو کبھی کے ختم تھے۔

ریڈیو اسٹیشن پر کوئی مشاعرہ تھا ہم لوگ بھی اتفاق سے پہنچ گئے، تمام شعراء تو موجود پر آپ نہ جانے کہاں غائب اشاروں سے پوچھ گچھ ہوئی تو منتظمین نے اشارے سے بتایا کہ قے کر رہے ہیں۔ توبہ!

شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ لائے اور کرسی پر ٹکا دیا اب حلیہ ملاحظہ ہو، میلا چست پاجامہ، کان میلیوں جیسا، اس پر بے تکا سا اوورکوٹ گلے میں چیکٹ مفلر اور سر پر جائے پوشی۔ واہ!

مائکروفون پر آکر نہ جانے کیا اول فول کہنے لگے۔ لہجے میں آب ِ آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا، ایک زمین پر تو دوسری آسمان پر کبھی ایک دائیں تو دوسری بائیں کونے میں، ایک ہاتھ مشین کی سی رفتار سے بالوں کی ایک ریت آلودہ لٹ کو بار بار کنپٹی پر سے اٹھائے جا رہا تھا اور وہ بے حیائی سے گرے جا رہی تھی اب خوش لحانی شروع۔ اللہ جانے کیا اور کیوں کہنا شروع کیا۔ بیچ بیچ میں دانت بھینچ کر نہ جانے کیا لیکچر بھی دیتے جاتے تھے اور پڑھتے ہوئے مائکروفون سے دور نکل گئے۔ واپس لاتے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔

"ہیں ان کے منہ کو کیا ہو گیا۔ کیا داڑھ میں درد ہے" میں نے شاہد سے پوچھا۔

"نہیں تو، یہ تو ہمیشہ سے ہے اس کے جبڑے میں" وہ بولے۔

"کوئی نہیں، پہلے تو کبھی بھی نہیں تھا" میں نے برا مان کر کہا اور مجھے کوئی یقین نہ آیا کہ مجاز کا جبڑا ہمیشہ سے ایسا ہی ہے یقیناً وہ مجھے جلانے کے لئے بن رہا ہے۔"

الغرض اس دن خوب ہی تو جی جلا، جب باہر آئے ہم لوگ تو آپ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اب جو باتوں کا طومار بند جائے تو اللہ توبہ، وہ طول طویل جملے جو کبھی ختم ہی نہ ہوں اور ایک میں دوسرا جڑتا ہی چلا جائے۔ مجھے شراب پئے ہوئے ہو کوئی تو ویسے بھی ذرا دحشت ہوتی ہے کہ نہ جانے کب دھول مار دے کیونکہ یہی رائے سنی ہے ہمیشہ سے ان لوگوں کے بارے میں، اور آپ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جوار کی بوری کا منہ کھل گیا اور بھر بھر کے دانے نکل رہے ہیں کیا مجال کہ مہلت دے اور کہہ سکیں کہ دلی شہر میں تانگے مشکل سے ملتے ہیں اور رات کے گیارہ بجے ہیں اب تو ٹھنے لگا خیر خود ہی کچھ دل میں نیکی آ گئی۔ بولے صبح آؤں گا۔

ایک تو مشاعرہ ہی کچھ بور تھا، دوسرے مجاز کی بدحواسیاں، جی متلا گیا۔ اس رات دیر تک ہم مجاز کا ذکرِ خیر کرتے رہے پھر فاتحہ پڑھ کر سو گئے۔

اور صبح ہی صبح کوئی چھ بجے ہوں گے کہ آپ وارد، اور کیسے کہ پہلے سے بھی زیادہ لبریز...... جوار کی بوریوں میں معلوم ہوتا تھا اس وقت تک مالے پس گئے ہیں اور منہ سے باتیں ایسے نکل رہی ہیں جیسے کسی نے سوکھے ستو گالوں میں بھر لئے ہوں اور چولہا پھونکنے کی مشق کرنا چاہتا ہو۔ جبڑا اور بھی بھنچ گیا تھا۔

باتوں کے معاملہ میں آپ مجاز کو حد سے زیادہ بے تکا پائیں گے کبھی آپ ملیں گے تو ہر بات کا جواب یک لفظی، آپ گھنٹہ بھر بٹھا لیجیے۔ کیا مجال جو کوئی انچ بھر سے زیادہ لمبا جملہ ہونٹوں کے پار ہو سکے، لیکن کسی دوسرے وقت آپ ملیں گے تو مجاز کے سوا نہ کسی سے بات کر سکیں گے اور نہ کسی کی سن سکیں گے۔ ملتے ہی فوراً آپ کے منہ میں تالا ڈال کر کانوں کو گرفتار کر لیں گے اب خواہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ وہ خود ہر سوال کا موزوں جواب دیتے چلے جائیں گے یہ حالت ان پر اُس وقت طاری ہوتی ہے جب دریا دلی سے بحرِ معرفت میں غوطہ لگا چکے ہوں، یہ میری دوسری ملاقات بدقسمتی سے کچھ ایسی ہی حالت میں ہوئی۔ باتوں کے آبشار پوری طاقت سے چھوٹ پڑے، بولتے بولتے گلے میں پھندا سا پڑا، معافی مانگ کر بولے "ذرا گلا خشک ہو رہا ہے۔" پھر جیب سے ایک بوتل نکالی "کوئی ایسی ویسی چیز نہیں عرقِ گلاب ہے ذرا گلا خستہ کر لوں" دو گھونٹ لے کے کاگ لگایا اور جیب میں واپس۔

"ہاں تو پھر؟"......

پھر ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل پڑی اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ریل نہیں مجاز کی زبان ہے جو چل رہی ہے ؎

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

اس شعر کو پڑھ کر ہمیشہ مجھے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا گویا کوئی جملہ احساسات کو طوفان میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے جذبات ریل کی جھپٹ کے ساتھ اڑنے لگے ہیں اور دماغ زقندیں بھر رہا ہے اور میرا جی چاہا کہ مجاز کا منہ کوئی بند کر دے تاکہ لاوا یوں بھڑاس بن کر ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مگر بوتل میں کاگ تو جب ہی لگایا جا سکتا ہے جب کہ وہ ثابت و سالم ہو، اگر چکنا چور ہو چکی تو الٹا ہاتھ کٹ جائے گا۔"

تو کوئی کھلے ہوئے منہ کو نہ بند کر سکا اور موتی یونہی رلتے رہے۔ میں نے موتی اس لئے کہا کہ مجاز کی زبان نہایت پاکیزہ اور ستھری ہوتی ہے عام طور پر بات کرنے میں ترشے ہوئے پتے تلے ذو معنی جملے بے تکان بنتے چلے جاتے ہیں۔ مجاز کی زبان کی دھار تو کچھ جوش کی صحبت ہی میں خوب چمکتی ہے معلوم ہوتا ہے تیغ سے لڑ رہے ہیں اور پھر مزا یہ کہ جملے نہایت مختصر مگر دو دھارے ہوتے ہیں جو کاٹتے ہیں پر اُلجھتے کہیں نہیں۔

میں نے یہ غلط کہا تھا کہ مجاز بحر معرفت میں غوطہ لگانے کے عادی ہیں۔ دراصل میرا مطلب تھا وہ شراب پیتے ہیں اور حماقت کی حد تک پیتے ہیں۔ پیتے وقت صرف ایک بات کا خیال رہتا ہے کہ جلد از جلد پئیں اور بہت سی پی لیں تاکہ دوسروں سے زیادہ حصہ لے۔ جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ حالت خراب ہو جاتی ہے۔ وقتی طور پر تو کچھ نہیں بعد میں یہ آگ کی بارش جب متواتر معدے اور جگر پر ہوتی ہے تو صحت کا تو کوئی سوال ہی ایک سرے سے نہیں رہتا شاید یہی وہ سب سے شدید مرض ہے جو جان کو لاگو ہے جس نے جسم کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اور دماغ پژمردہ ہو گیا ہے ایک تو کڑوا کریلا اوپر سے نیم چڑھا، بالکل ہڈیوں اور کھال کا معاملہ باقی ہے۔

تو اس دوسری ملاقات نے رہی سہی دلچسپی بھی ختم کر دی۔ سنی سنائی پر ٹال بھی سکتے تھے پر چشم دید حالت پر تو خلوص دل سے فاتحہ پڑھنے کا حق حاصل ہو گیا، خدا خدا کر کے چائے آئی اور باتوں کے بھاؤ میں کچھ کمی ہوئی ادھر سے بھی دو چار سوالات کئے گئے کہ

بھیا تیرا جی چاہے جہاں لے چل، بیچ میں دو چار جگہ لوگوں کو جگا جگا کر شرف ملاقات بھی بخشتے آرہے ہیں۔

پھر کچھ موڈ میں آگئے اور نظم سنانا شروع کی، بیچ بیچ میں اتنی باتیں کرتے گئے کہ جی جل گیا۔ دھوپ نکلتے نکلتے کچھ روپ رنگ اترنا شروع ہوگیا تو کچھ خاموش ہوگئے پھر ہم لوگ باہر گئے تو اتر کر راستہ میں کسی کتب فروش سے اتنی دیر باتیں کیں کہ مجبوراً انہیں چھوڑ کر جانا پڑا۔

اس کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی کچھ زیادہ ڈھونڈی گئی کہ کچھ ماہ ہوتے سنا کہ منچلے انہیں بمبئی سمیٹ لائے ہیں، یہ بھی برا نہ ہوا کون جانے شاید اب بھی بین بٹور کر کام چلایا جاسکے اور اب تیسری دفعہ جب ملی تو دیکھا کہ کچھ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گزر گئے ہیں جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اڑا کر لے گئے۔ جیسے یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے، کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سُن کر ڈالا ہے، چہرے کو غور سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا آنکھوں میں ایک مفاہمانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں ایک بار نہیں کئی بار مختلف گروہوں میں دیکھا اسی طرح غیر حاضر قسم کا وجود کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا، چلتے دیکھ کر چل پڑنا۔ بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا، عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا، جسم تو موجود ہے مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔ مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح آواز گویا کوسوں دور سے گرتی پڑتی چلی آرہی ہے۔ داد دیتے جی ڈرتا ہے کہ کہیں سچ مچ اسٹیج سے نیچے نہ گر پڑیں۔

مگر قسمت سے ساتھی کچھ ایسے بے ڈھب مل گئے ہیں جو انہیں کانچ کے گلاس کی طرح اٹھائے

پھرتے ہیں مگر واہ رے دم خم جوں موقع مل جاتا ہے یہ کانچ کے گلاس۔ صاحب فوراً چٹان سے سر دے مارتے ہیں۔ لوگوں نے رائے دی کہ پیسے کماؤ پیسے، اللہ نے چاہا تو سارے روگ دور ہو جائیں گے آپ نے دو چار فلمی گانے لکھے، پیسے کما ڈالے اور فوراً ہی اللہ شافی کر گئے نوبت بہ ایں جا رسید کہ ڈر لگنے لگا کہ اگر فراغت ہوئی تو تنگی اور بڑھ جائے گی لیکن حال ہی میں کچھ دنوں سے مجاز کو شاید یقین ہو گیا ہے کہ وہ چند فوجدار قسم کے لوگوں میں آ پھنسے ہیں جو انہیں یوں سستے داموں کھونے کو تیار نہیں ہوں گے پہلے تو جناب کچھ جز بز ہوئے اور دھمکی دی کہ اگر لوگوں نے پیچھا چھوڑا تو چلے جائیں گے، واپسی پر اب کچھ ہاتھ ڈھیلے کر رہے ہیں اور وہ لوگ ڈھٹائی کی حد تک پہنچی ہوئی کوششوں سے انہیں گھسیٹ کر اس خود فراموشی کے غار میں سے واپس نکال رہے ہیں جس میں ڈوبنے پر وہ مصر ہیں اور اب تو غنڈہ ہو چلا ہے کہ وہ انہیں کھینچ ہی لائیں گے۔

یہی وجہ ہے شاید، جواب کبھی مجاز کہیں ملتے ہیں تو لوگوں کو ایسے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہیں کہ "ہاں ہاں کچھ یاد تو پڑتا ہے کہیں دیکھا ضرور ہے اور وہ مہمانوں جیسا سایہ چہرے پر سے سرکتا جا رہا ہے وہ علی گڑھ، لکھنؤ کی پُر لطف صحبتیں جو افسانہ بنتی جا رہی تھیں پھر کچھ کچھ زندہ ہو رہی ہیں۔ ایک ہلکی سی پھریری تو لی ہے اب دیکھنا ہے جان کب پڑتی ہے۔

ویسے تو مجاز نے ایک پتلی سی کتاب مکمل کر کے ادب اور شاعری کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ ہم نے ان کا نام چوٹی کے شعراء میں بڑی آسانی سے شمار کر لیا ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ ساری عمر اس کا تکیہ لگائے مزے سے بیٹھے رہیں اگر وہ چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ یہ قیامت جیسے طوفان بھرے زمانہ میں اگر وہ لمبی تان کر سونا چاہیں تو آنکھیں بھلے ہی بند رہیں نیند نہ آئے گی۔ دنیا تو اس تیزی سے قلابازیاں کھا رہی ہے، ایسے وقت میں یہ چپ کا روزہ کب تک؟

تعارف

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ اُلفت کا طلب گار ہوں میں

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضراب الم
ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں

رنگ نظارۂ قدرت مجھ سے
جانِ رنگینیٔ کہسار ہوں میں

نشۂ نرگسِ خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے
اور رسوا سر بازار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

اہلِ دُنیا کے لئے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

عین اس بے سرو سامانی میں
کیا یہ کم ہے کہ گہر بار ہوں میں

میری باتوں میں مسیحائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں

مجھ سے برہم ہے مزاج پیری
مجرم شوخیٔ گفتار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوع انساں کا پرستار ہوں میں

محفل دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
اک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

نظمیں

نذرِ جوش

ظلمات کے پردے سے ہویدا ہو سحر کیوں
اب شکوہ بایں تنگیِ دامانِ نظر کیوں
اے جوش بایں وضع یہ شعلے یہ شرر کیوں
جب کھو ہی دی پھر گم شدۂ جنت پہ نظر کیوں
سرخیلِ تُنک گام کو مرسر کی خبر کیا
اک شمع سرِ طُور بآہنگِ دگر کیوں
ظلمت جو ترے بس میں ہو تو نور کی مت پوچھ
یہ تاب و تبِ چشمۂ حیواں پہ نظر کیوں
اک سعیِ جہاں دیدہ نہ ہو نذرِ حجابات
اک لرزشِ بوسیدہ پسِ پردۂ در کیوں

نذرِ دل

(اُن کے نام)

اپنے دل کو دونوں عالم سے اُٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں
کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے ، کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں
میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی
تم کو بزم ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
سر پہ رکھ سکتا ہوں تاج کشور نورانیاں
محفل خورشید کو نیچا دکھا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بجھا سکتا ہوں میں، آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے
گیت گا سکتا ہوں میں، آنسو بہا سکتا ہوں میں
جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز
بربط فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر
مجھ کو یہ دعوے کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پہ اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا
متاعِ سوز و سازِ زندگی، پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
ملا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا
ہوس کاری ہے جرمِ خودکشی میری شریعت میں
یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا
نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اُس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اُس کے گیت بھی دل کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بے خودی میں نام اُس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی، یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا

کہاں تک قصۂ آلام فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

ایک دوست کی خوش مذاقی پر

ہو نہیں سکتا تری اس "خوش مذاقی" کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
رکھ بھی دے اب اس کتاب خشک کو بالائے طاق
اُڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق
چھپ رہا ہے پردۂ مغرب میں مہر زر فشاں
دید کے قابل ہیں بادل میں شفق کی سرخیاں
موجزن جوئے شفق ہے اس طرح زیر سحاب
جس طرح رنگین شیشوں میں جھلکتی ہے شراب
اک نگارش آتشیں برشے پہ ہے چھایا ہوا
جیسے عارض پر عروس نو کے ہو رنگ حیا
شاید گیتی پہ لہرانے کو ہیں گیسوئے شب
آسماں پر منعقد ہونے کو ہے بزم طرب
اُڑ رہے ہیں جستجو میں آشیانوں کے طیور
آ چلا ہے آئینے میں چاند کے ہلکا سا نور

دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
کیا تری نظروں میں یہ رنگینیاں بھاتی نہیں
کیا ہوائے سرد تیرے دل کو تڑپاتی نہیں
کیا نہیں ہوتی تجھے محسوس مجھ کو سچ بتا
تیز جھونکوں میں ہوا کے گنگنانے کی صدا
سبزہ و گل دیکھ کر تجھ کو خوشی ہوتی نہیں
اُف ترے احساس میں اتنی بھی رنگینی نہیں
حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

نغمۂ ٹیگور

(ترجمہ از گارڈنر)

میں نے ہنگام صبح، اے دنیا
تیرے گلشن سے ایک گل توڑا
اپنے سینے پہ دی جگہ اس کو
چبھ گیا دل میں لیکن اک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا
گل تھا پژمردہ درد باقی تھا

حسن و خوشبو میں اک سے اک بڑھ کر
اور بھی ہوں گے تجھ میں گل پیدا
میری گل چینیوں کا وقت مگر
ایک مدت ہوئی کہ ختم ہوا
اور اب جب کہ رات طاری ہے
گل نہیں پاس درد باقی ہے

کس سے محبت ہے؟

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اُس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشت گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو

وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزم امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں خرد سامانیاں اُس کی

زباں پر ہیں ابھی عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مرے تخیّل کے بازو بھی اُس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر ہے تو قندیل رہبانی
عذار نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمت تاج سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفل نورانیاں اُس کی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اُس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اُس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درس تمکیں دے گئیں نادانیاں اُس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گنگنایا ہے
سنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اُس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اُس کی

لب لعلیں پہ لالی ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبیں نورافشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اُس کی

کوئی میرے سوا اُس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس بارگاہ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

ایک غمگین یاد

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فراز آسماں پہ کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اُٹھتی تھی اُس کی چشم خنداں میں
خمستان فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زلف شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہت خلد بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

اُمنڈ آتے تھے جب اشک محبت اُس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسم کی
جب اُس کے ہونٹ آجاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگام رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشر جذبات ہوتا تھا
وہ محو خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اُس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

خبر کیا تھی کہ وہ اک روز مجھ کو بھول جائے گی
اور اُس کی یاد مجھ کو خون کے آنسو رلائے گی

ان کا جشن سالگرہ

اِک مجمع رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا روح بہار و گل و نسریں
آنکھوں کی چمک رشک بزم مہ و پروین
پیراہن زرتار میں اک پیکر سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا
سہرے میں جھمکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی
خاموشیٔ محجوب میں اک سیل معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزان جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی دعا بڑھ کے قدم چوم رہی ہے

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

بربطِ شکستہ

اُس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سنا دو نا
سرد ہے فضا دل کی آگ تم لگا دو نا
کیا حسین تیور تھے، کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو تھی، حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا

گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

حسن و عشق

مجھ سے مت پوچھ "مرے حسن میں کیا رکھا ہے"
آنکھ سے پردۂ ظلمات اُٹھا رکھا ہے
میری دنیا کہ مرے غم سے جہنم بردوش
تو نے دنیا کو بھی فردوس بنا رکھا ہے

مجھ سے مت پوچھ ترے عشق میں کیا رکھا ہے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے
جگمگا اُٹھتی ہے دنیائے تخیل جس سے
دل میں وہ شعلۂ جانسوز دبا رکھا ہے

نمائش میں

وہ کچھ دوشیزگان ناز پرور
کھڑی ہیں اک بساطی کی دکاں پر
نظر کے سامنے ہے ایک محشر
اور اک محشر ہے میرے دل کے اندر
سنہرا کام رنگیں ساریوں پر
بساط آسماں پر ماہ و اختر
جمال و حسن کے پر رعب تیور
نمایاں چاند سی پیشانیوں پر
وہ رخساروں پہ ہلکی ہلکی سرخی
لبوں میں پرفشاں روح گل تر
سیہ زلفوں میں روح سنبلستاں
نظر سرچشمۂ تسنیم و کوثر
ادائے ناز عزق کیف صہبا
سیہ مژگاں شراب آلودہ نشتر
چمک تاروں کی چشم سرمگیں میں
جھلک چاندی کی جسم مرمریں پر
وہ خوشبو آ رہی ہے پیرہن سے
فضا ہے دور تک جس سے معطر

تبسم اور ہنسی کے بزم طوفاں
فضاؤں میں مسلسل بارش زر
نشاط رنگ و بو سے چور آنکھیں
شراب ناب سے لبریز ساغر
وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں
فضائے نور میں کبوتر کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم
شب مہتاب میں جیسے سمندر
ستاروں کی نگاہیں جھک گئی ہیں
زمیں پھر خندہ زن ہے آسماں پر
کوئی آئینہ دار حسن فارس
کسی میں حسن یونانی کے جوہر
کسی میں عکس "معصوم کلیسا"
کسی میں پرتو اصنام آذر
یہ شیریں ہے وہ نوشابہ ہے شاید
نہیں یاں فرق فرہاد و سکندر
یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق
وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشید درخشاں
وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر

ہنسی اس کی طلوعِ صبحِ خنداں
نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن
یہ آئینہ جبیں وہ ماہ پیکر

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو
وہ لہریں سی اُٹھیں کچھ ساریوں پر
خرامِ ناز سے نغمے جگاتی!
وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی
کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر
کبھی آنکھیں دکانوں پر جمی ہیں
کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر
ادھر ہم نے اک آہ سرد کھینچی
ہنسی پھر آگئی اپنے کئے پر

آج کی رات

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے!
اس نے دیکھا تو بہ انداز دگر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بکنار
سنگ ریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

چھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلاب نشاط
اللہ اللہ مرا کیف نظر آج کی رات

شبستانِ تجلی کا فسوں کیا کہیے!
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات

قصرِ گیتی میں اُمنڈ آیا ہے طوفانِ حیات
موت لرزاں ہے پسِ پردۂ در آج کی رات

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال!
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار!
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات *

میری ہر سانس پہ وہ اُن کی توجہ کیا خوب!
میری ہر بات پہ وہ جنبشِ سر آج کی رات
وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات
اُف وہ وارفتگیٔ شوق میں اک دہم لطیف
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نظر آج کی رات
مذہبِ عشق میں جائز ہے یقیناً، جائز
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات
اپنی رفعت پہ جو نازاں ہیں تو نازاں ہی رہیں
کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ اِدھر آج کی رات
اُن کے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

نذرِ خالدہ

(سلم یونیورسٹی یونین ہال میں خالدہ ادیب خانم کا خیر مقدم)

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج
دیکھنا یہ کون آخر زیب کاشانہ ہے آج
کیف صہبائے طرب میں غرقِ مے خانہ ہے آج
ہر شجر ساقیٔ مے، ہر پھول پیمانہ ہے آج
غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

نرگس مخمور ہے لذت کش خواب نشاط
پھوٹ نکلا ہے گل و نسریں سے سیلاب نشاط
اہل محفل کے لئے مشکل ہے اب تاب نشاط
آج پیمانوں سے چھلکے گی مے ناب نشاط
پر فشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ نسیم جاں فزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطرب رنگیں نوا
ٹوٹ جاتے آج اک اک تار تیرے ساز کا
ذکر جس کا زہرہ و پروین کے شانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

خالدہ تو ہے بہشت ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نور حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے ہے تو معصوم مریم آشکار
تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار
گل پیشیاں قلب بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمار کوثر و تسنیم ہے

یوں تو ہم ہر شمع علم و فن کے پروانے رہے
یہ حقیقت ہے کہ ہم تیرے بھی دیوانے رہے
مدتوں اپنی زباں پر تیرے افسانے رہے
تو رہی بیگانہ لیکن ہم نہ بیگانے رہے
یاد تیری اک زمانے سے ہمارے دل میں تھی
تو یہاں آنے سے پہلے بھی اسی محفل میں تھی

شوق کی شورش جمال و نور کا سیلاب ہے
ہر کلی ساز طرب ہے ہر نظر مضراب ہے
آنکھ حیراں روح ارباب وفا بے تاب ہے
یہ ہمارے خواب کی تعبیر ہے یا خواب ہے
لالہ و گل کیا چمن بھی تیرے قدموں پر نثار
یہ گہر ہائے سخن بھی تیرے قدموں پر نثار

اے مقدس حور اے پروردۂ موج نسیم
روح عشرت گاہ ساحل جان طوفان عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجابات قدیم
ضعف دکھلایا ہے جب بھی فطرت احرار نے
آگ برسا دی ہے تیرے نطق گوہر بار نے

رہ چکی ہے ہاتھ میں تیرے وہ تیغ بے نیام
جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترک افتادہ کو تو نے ہی دیا اذن خرام
تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام
تو نے جو احساں کیے ہیں ملت احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روح ارباب نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرور عشرت جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

محرم درد و مسرت راز دار صبح و شام
محفل فطرت کی خاموشی ہے تجھ سے ہمکلام
تیری ہستی آسمان ترک کا ماہ تمام
تو محبت، ہر نفس تیرا محبت کا پیام
گلشن مشرق میں مانند صبا آئی ہے تو!
صبح روشن کا پیام جانفزا لائی ہے تو!

قربتِ گل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ
چاند کی تنویر میں کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہے میخواروں سے پوچھ
چارہ سازی میں مزا کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ
روح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خارِ نارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکر لاحاصل نہ ہو، اندیشہ باطل نہ ہو

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نوشنالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھاکر، لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کرکے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامن موج ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعت کہسار سے میداں میں آتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آدمیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ براندام کرتی انجم شب تاب کو
آشیاں میں طائر وحشی کو چونکاتی ہوئی!
یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخش بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزل مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں ساز سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتش پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی
شور پیہم سے دل گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اِتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
آگے آگے "جستجو آمیز" نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
اک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزیِ رفتار کے سکے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پہ اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اُڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ ڈراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

انقلاب

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ بیچا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمن ادراک پر

یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دل بے تاب میں
بہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں
چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو!
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خون آرزو
پھر شبستان طرب کی راہ دکھلاتا ہے تو
مجھ کو کرنا چاہتا ہے پھر خراب رنگ و بو
میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو
میں نے یہ مانا غم ہستی مٹا سکتا ہے تو
میں نے مانا تیری موسیقی ہے اتنی پر اثر
جھوم اٹھتے ہیں فرشتے تک ترے نغمات پر
ہاں یہ سچ ہے زمزمے تیرے مچاتے ہیں وہ دھوم
جھوم جاتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم
تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاط زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیف و انبساط زندگی
تیری صورت میں سرمدی، باغ تصوف کی بہار
تیرے ہی نغموں سے بے خود عابد شب زندہ دار
بلبلیں نغمہ سرا ہیں تیری ہی تقلید میں
تیرے ہی نغموں سے دھومیں محفل نابید میں
مجھ کو تیرے سحر موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحن داؤدی سے کب انکار ہے

بزم ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرش گیتی سے سکوں اب مائل پرواز ہے
ابر کے پردوں میں ساز جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب
آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون اُبلے گا ابھی
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور ڈراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
سرکشی کی مانند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
گر پڑیں گے خوف سے ایوان عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شراب لالہ گوں

خون کی بُو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پرسکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجد میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگس مخمور چشم خوں فشاں ہو جائے گی
کوہساروں کی طرف سے "سرخ آندھی" آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا!
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام

اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خوں بیں سبق
آسماں پر خاک ہو گی، فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں با ہزاراں آب و تاب!
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

شوق گریزاں

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا
مجھ میں تُو روح سرمدی مت پھونک
رونق بزم عارفاں نہ بنا
دشت ظلمات میں بھٹکنے دے
میری راہوں کو کہکشاں نہ بنا
عشرت جہل و تیرگی مت چھین
محرم راز دو جہاں نہ بنا
بجلیوں سے جہاں نہ ہو چشمک
اُس گلستاں میں آشیاں نہ بنا
خار چشم حریف رہنے دے
حرز بازوئے دوستاں نہ بنا
میری خود بینیاں نہ لے مجھ سے
جلوہ افروز مہوشاں نہ بنا

دل صد پارۂ حوادث کو
تختۂ مشق گل رخاں نہ بنا
میری خودداریوں کا خون نہ کر
مطرب بزم دلبراں نہ بنا
ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت
مجھ کو ان کا مزا جداں نہ بنا
جس کو اپنی خبر نہیں رہتی
اُس کو سالار کارواں نہ بنا
میری جانب نگاہ لطف نہ کر
غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا
اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے
اس زمیں کو تو آسماں نہ بنا
میری ہستی نیاز و شوق سہی
اس کو عنوان داستاں نہ بنا
راز تیرا چھپا نہیں سکتا
تو مجھے اپنا راز داں نہ بنا

خانہ بدوش

بستی سے تھوڑی دور چٹانوں کے درمیاں
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں

ان کی کہیں زمین نہ ان کا کہیں مکاں
پھرتے ہیں یونہی شام و سحر زیرِ آسماں
دھوپ اور ابر و بار کے مارے ہوئے غریب
یہ لوگ وہ ہیں جن کو غلامی نہیں نصیب

اس کارواں میں طفل بھی ہیں نوجواں بھی ہیں
بوڑھے بھی ہیں مریض بھی ہیں ناتواں بھی ہیں
میلے پھٹے لباس ہیں کچھ دیوباں بھی ہیں
سب زندگی سے تنگ بھی ہیں سرگراں بھی ہیں
بیزار زندگی سے ہیں پیرو جواں سبھی
الطاف شہریار کے ہیں نوحہ خواں بھی

ماتھے پہ محنت کوشئ پیہم کی داستاں
آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں
چہروں پہ تازیانۂ افلاس کے نشاں
ہر ہر ادا سے بھوک کی بے تابیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

اٹھے ہیں جس کی گود سے آذر وہ قوم ہے
زرتشت ہیں جس نے جرخ سے اختر وہ قوم ہے

پلٹے ہیں جس نے دہر کے دفتر وہ قوم ہے
پیدا کئے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریک حلقۂ نوع بشر نہیں
انسان ہی تو ہیں یہ کوئی جانور نہیں

آخر زمانہ ان کو ستائے گا کب تلک؟
کب سے جلا رہا ہے جلائے گا کب تلک؟
کب سے مٹا رہا ہے مٹائے گا کب تلک؟
ان کے لہو کو جوش نہ آئے گا کب تلک؟
مایوسیوں کی تہ میں جنوں خیزیاں بھی ہیں
افلاس کی سرشت میں خونریزیاں بھی ہیں

نورا

نرس کی چارہ گری

وہ نوخیز نورا وہ اک بنت مریم
وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پرخم
وہ ارض کلیسا کی اک ماہ پارہ
وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوس مریم کا اک غنچۂ تر
وہ تثلیث کی دختر نیک اختر

وہ اک برس تھی چارہ گر جس کو کہیے
مداوائے دردِ جگر جس کو کہیے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُررعب تیور وہ شاداب چہرہ
متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر
یہ تحریر تھا صاف اُس کی جبیں پر
سفید اور شفاف کپڑے پہن کر
مرے پاس آتی تھی اک حور بن کر
وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا
کہ انداز تھا اُس میں جبریل کا سا
وہ اک مرمریں حورِ خلد بریں کی
وہ تعبیر آذر کے خواب حسیں کی
وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی
نگارِ شفق تھی جمالِ سحر تھی
وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ، وہ پرتو
سلیماں کی وہ اک کنیزِ سبک رو
کبھی اُس کی شوخی میں سنجیدگی تھی
کبھی اُس کی سنجیدگی میں بھی شوخی

گھڑی چپ، گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں
سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں
عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ
کبھی سوز تھی وہ، کبھی ساز تھی وہ
نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اٹھتی
نظر مجھ کو آتی محبت کی دیوی
وہ اس وقت اک پیکر نور ہوتی
تخیل کی پرواز سے دور ہوتی
وہ انجیل پڑھ کر سناتی تھی مجھ کو
ہنساتی تھی مجھ کو رلاتی تھی مجھ کو
دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی
"اب اچھے ہو" ہر روز مژدہ سناتی
سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے
وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی ٹکائے
خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی
نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی
جھپکتی ہوئی بار بار اس کی پلکیں
جبیں پر شکن بے قرار اس کی پلکیں
وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے
وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ، ادا راہبانہ
مہک گیسوؤں سے چلی آ رہی تھی
مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی
جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی
لب لعل افشاں سے اک شے چرالی
وہ شے جس کو اب، کیا کہوں کیا سمجھیے
بہشت جوانی کا تحفہ سمجھیے
شراب عجب کا اک جام رنگیں
سبو زار فطرت کا اک جام رنگیں
میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ
ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
میں دیکھوں گا اُس کے بپھرنے کا عالم
جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم
ادھر دل میں اک شور محشر بپا تھا
مگر اُس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر

نہیں جاتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

ننھی بچارن

اک ننھی منی سی بچارن
پتلی باہیں ، پتلی گردن
بھور بھئے مندر آئی ہے
آئی نہیں ہے ماں لائی ہے
وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے
نیند ابھی آنکھوں میں بھری ہے
ٹھوڑی تک لٹ آئی ہوئی ہے
یونہی سی لہرائی ہوئی ہے
آنکھوں میں تاروں کی چمک ہے
مکھڑے پہ چاندی کی جھلک ہے
کیسی سندر ہے کیا کہیے
ننھی سی اک سیتا کہیے
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے
پتھر پر اک پھول کھلا ہے

چاند کا ٹکڑا پھول کی ڈالی
کمسن، سیدھی، بھولی بھالی
ہاتھ میں پیتل کی تھالی ہے
کان میں چاندی کی بالی ہے
دل میں لیکن دھیان نہیں ہے
پوجا کا کچھ گیان نہیں ہے
کیسی بھولی اور سیدھی ہے
مندر کی چھت دیکھ رہی ہے
ماں بڑھ کر چٹکی لیتی ہے
چپکے چپکے ہنس دیتی ہے
ہنسنا رونا اس کا مذہب
اس کو پوجا سے کیا مطلب
خود تو آئی ہے مندر میں
من اس کا ہے گڑیا گھر میں

نذرِ علی گڑھ[1]

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

[1] مجاز کے انتقال کے بعد اسی مشہور نظم کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا "قومی ترانہ" کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ (م۔ س۔ ناظر)

جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
یاں حسن کی برق چمکتی ہے، یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے
ہر شام ہے شام مصر یہاں، ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشت جنوں دیوانوں کا، یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا، یہ خلد بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو اُفتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں
اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چوسے ہیں
اس بزم میں گر گر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بجھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

یاں تم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں
اس گل کدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا، ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

دلّی سے واپسی

رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولانگاہ تیرے بوستاں

تیرا دل دھڑکا چکے ہیں میرے احساسات بھی
تیرے ایوانوں میں گونجے ہیں مرے نغمات بھی
رشکِ شیراز کہیں، ہندوستاں کی آبرو
سرزمینِ حسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بو
معبدِ حسن و محبت، بارگاہِ سوز و ساز
تیرے بت خانے حسیں، تیرے کلیسا دل نواز
ذکرِ یوسف کا تو کیا کہیے تری سرکار میں
خود زلیخا آکے بکتی ہے ترے بازار میں
جنتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں
عقلِ ساقی سلامت! بزمِ انجم برقرار
نازنینانِ حرم پہ رحمتِ پروردگار
یاد آئے گی مجھے بے طرح یاد آئے گی تو!
عین وقت مے کشی آنکھوں میں پھر جائے گی تو!
کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں مخملیں
کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں
دل نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا میں
اک نشیمن میں نے چھوڑا، اک نشیمن چھٹ گیا
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا

دل میں سوزِ غم کی اک دنیا لئے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پئے جاتا ہوں میں
جاتے جاتے لیکن اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بانداز دگر آؤں گا میں
آہ وہ چکر دیئے ہیں گردشِ ایام نے
کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تلخیٔ آلام نے
فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق، اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب
سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا
لالہ زار رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

مسافر

مسافر یونہی گیت گائے چلا جا
سرِ رہگزر کچھ سنائے چلا جا
تری زندگی سوز و سازِ محبت
ہنسائے چلا جا، رلائے چلا جا
ترے زمزمے ہیں خنک بھی تپاں بھی
لگائے چلا جا، بجھائے چلا جا

کوئی لاکھ روکے، کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا
جہاں بھی تجھے راستے میں ملیں گے
نظر مت ملا، مسکرائے چلا جا
عبث کے نقشے، تمنا کے خاکے
بنائے چلا جا، مٹائے چلا جا
قدامت صدیں کھینچتی ہی رہے گی
قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا
قسم شوق کی فطرت مضطرب کی
یونہی نت نئی دھن میں گائے چلا جا
جو پرچم اٹھا ہی لیا سرکشی کا!
اسے آسماں تک اڑائے چلا جا

اندھیری رات کا مسافر

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نور ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، ابر من محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی، حسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پر زور آندھی ہے، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں پیہم برہمی ہے، آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے، کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں، چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اُفق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغ دیر، فانوس حرم، قندیل رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیاز نور عرفانی
نہ ناقوس برہمن ہے، نہ آہنگ ہدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے، جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں شعلہ افشاں دیو استبداد کا خنجر
سیاست کی سناں میں، اہل زر کے خونچکاں تیور
قریب بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ہدی پر بارش لطف و کرم، نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی، تیز سنگینیں ہیں، خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پر ہول نقشے ہیں
کمانوں کے مقابل توپ ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل ، تازیانے ، بیڑیاں ، پھانسی کے تختے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اُفق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

طفلی کے خواب

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
اُلجھے انہیں حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے ساز حضرت سعدی نے جس جگہ
اُس بوستاں کے شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوشِ ثریا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو مہِ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کش مکش عقل سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں!

دل کو ہو شاہزادیِ مقصد کی دھن لگی
حیراں سراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو، خارزار ہو، وادی ہو، آگ ہو،
اک دن انہیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیم دہر کے
اُن چند کشتگانِ غم دل میں ہم بھی ہوں

نوجوان سے

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

ترے خرام میں ہے زلزلوں کا رازِ نہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر

ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم
وہ بانکپن، وہ اچھوتا شباب پیدا کر

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر

نہ دیکھ زہد کی تو عصمتِ گنہ آلود
گنہ میں فطرتِ عصمت مآب پیدا کر

ترے جلو میں نئی جنتیں، نئے دوزخ
نئی جزائیں، انوکھے عذاب پیدا کر

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
گرا دے قصر تمدن کہ اک فریب ہے یہ
اٹھا دے رسم محبت، عذاب پیدا کر
جو ہو سکے تمہیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
ہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

نوجوان خاتون سے

حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا
تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
تری چیں جبیں خود اک سزا قانون فطرت میں
اسی شمشیر سے کار سزا لیتی تو اچھا تھا
یہ تیرا زرد رخ، یہ خشک لب، یہ دہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

دل مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے زیر نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل؟
بھری محفل میں اگر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انہیں تو رنگ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سنا ہیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پردہ اور عصمت

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے، مشیت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

صبا اور گلستاں سے دامن کشیدہ
نوائے فسوں خیز اور ناشنیدہ
تجلی رخسار اور نادمیدہ
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

سر رہگذر چھپ چھپا کر گزرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا، حجابوں میں مرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

خیالات پیہم میں ہر وقت گم سم
دل نرم و نازک پہ ابر توہم
بجھا سا تبسم، گھٹا سا تکلم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

وہ اک کاہش تلخ ہر آن دل میں
وہ شام و سحر ایک خلجان دل میں
اُمنڈتا ہُوا ایک طوفان دل میں
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم انجمِ شب کے ذوقِ سفر کی
قسم تازگی نسیمِ سحر کی
قسم آسمانوں کے شمس و قمر کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم شوخیِ عشق سنجو گتا کی
قسم جون کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دھکی ہوئی شمشیر سی!
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آتی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں ، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے ، یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سرمایہ داری

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی رَو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

نہ دیکھے ہیں برے اس نے نہ پرکھے ہیں بھلے اس نے
شکنجوں میں جکڑ کر گھونٹ ڈالے ہیں گلے اس نے
بلائے بے اماں ہے طور ہی اس کے نرالے ہیں
کہ اس نے غیظ میں اُجڑے ہوئے گھر پھونک ڈالے ہیں
قیامت اس کے غمزے، جان لیوا ہیں ستم اس کے
ہمیشہ سینۂ مفلس پہ پڑتے ہیں قدم اس کے
کہیں یہ خون سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہے
کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے، رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر گل باغ عالم کو جہنم کر دیا اس نے
درندے سر جھکا دیتے ہیں لوہا مان کر اس کا
نظر سفاک تر اس کی، نفس مکروہ، تر اس کا
جدھر چلتی ہے بربادی کے ساماں ساتھ چلتے ہیں
نحوست ہم سفر ہوتی ہے شیطاں ساتھ چلتے ہیں
یہ اکثر لوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہے چھپ کر خانقاہوں میں
جوان مردوں کے ہاتھوں سے یہ نیزے چھین لیتی ہے
یہ ڈائن ہے بھری گودوں سے بچے چھین لیتی ہے

یہ غیرت چھین لیتی ہے، حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے
یہ آشوب ہلاکت، فتنہ اسکندر و دارا
زمیں کے دیوتاؤں کی کنیز انجمن آرا
ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے
گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے
مبارک دوستو بسریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ

ہمارا جھنڈا

شیر ہیں چلتے ہیں دراتے ہوئے
بادلوں کی طرح منڈلاتے ہوئے
زندگی کی راگنی گاتے ہوئے
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

ہاں یہ سچ ہے بھوک سے حیران ہیں
پر یہ مت سمجھو کہ ہم بے جان ہیں
اس بری حالت میں بھی طوفان ہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

ہم وہ ہیں جو بے رخی کرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو موت سے ڈرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو مر کے بھی مرتے نہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

چین سے محلوں میں ہم رہتے نہیں
عیش کی گنگا میں ہم بہتے نہیں
بھید دشمن سے کبھی کہتے نہیں
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا
توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا بھی یونہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

کب بھلا دھمکی سے گھبراتے ہیں ہم
دل میں جو ہوتا ہے کہہ جاتے ہیں ہم
آسماں ہلتا ہے جب، گاتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

لاکھ لشکر آئیں کب ہلتے ہیں ہم
آندھیوں میں جنگ کی کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

ساقی

مری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی
بھڑکتی جا رہی ہے دم بدم اک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی، یہ کیسا دور ہے ساقی
وہ نشے دے جس سے نیند آجائے عقل فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمیز لطف و جور ہے ساقی
کہیں اک رند اور واماندۂ افکار تنہائی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی
جوانی اور یوں گھر جائے طوفان حوادث میں
خدا رکھے ابھی تو بے خودی کا دور ہے ساقی
چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی
مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

ایک جلاوطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیٔ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے
"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"

رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھونرے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش
مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آپہنچا!
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آپہنچا!

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اعیار کے چہروں سے اُڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے

اپنے مے خانے کا میکش بے حال سے ہے یہ
ہاں وہی مرد جواں بخت و جواں سال ہے یہ

مرد سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
روح انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عیش کی ہر شورش فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اُسی بدمست جوانی کی قسم
آ کہ اک بار گلے سے تو لگا لیں تجھ کو
اپنے آغوش محبت میں اُٹھا لیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوز پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنس آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم

ساقی و رندے تیرے ہیں، مے گلفام تیری
اُٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرت ناکام تیری
برہمن تیرے ہیں کل ملہ اسلام تیری
صبح کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تیری

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے میں بیاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں
سرفروشان بلا کش کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

مزدوروں کا گیت

محنت سے یہ مانا چور ہیں، ہم
آرام سے کوسوں دور ہیں، ہم
پر لڑنے پہ مجبور ہیں، ہم
مزدور ہیں، ہم! مزدور ہیں، ہم

گو آفت و غم کے مارے ہیں
ہم خاک نہیں ہیں تارے ہیں
اس جگ کے راج دلارے ہیں
مزدور ہیں، ہم! مزدور ہیں ہم

بننے کی تمنا رکھتے ہیں
مٹنے کا کلیجہ رکھتے ہیں
سرکش ہیں سراُونچا رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہر چند کہ ہیں ادبار میں ہم
کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

جس سمت بڑھا دیتے ہیں قدم
جھک جاتے ہیں شاہوں کے پرچم
ساونت ہیں ہم بلونت ہیں ہم
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

گو جان پہ لاکھوں بار بنی
کر گزرے مگر جو جی میں ٹھنی
ہم دل کے کھرے باتوں کے دھنی
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم کیا ہیں کبھی دکھلا دیں گے
ہم تنظم کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم جسم میں طاقت رکھتے ہیں
سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزم بغاوت رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

جس روز بغاوت کر دیں گے
دنیا میں قیامت کر دیں گے
خوابوں کو حقیقت کر دیں گے
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

ہم قبضہ کریں گے دفتر پہ
ہم وار کریں گے قیصر پہ
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پہ
مزدور ہیں ہم! مزدور ہیں ہم

مزار رہنما

(بر مزار ڈاکٹر انصاری مرحوم)

نہیں ارباب دل اہلِ نظر بھی
نہاں ہے سنگِ پاروں میں گہر بھی

جمال قوم بھی، صاحب نظر بھی
مسافر بھی، خضر بھی، چارہ گر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروش برق و طوفاں شور بھی

سکون دیر، تقدیس کلیسا
گداز اُمت خیر البشر بھی

بہ تربت ہے امیر کارواں کی
منزل بھی ہے شمع رہ گزر بھی

اِدھر بھی آ

یہ جہد و کش کمش یہ خروش جہاں بھی دیکھ
ادبار کی، سروں پہ گھنی بدلیاں بھی دیکھ
یہ توپ یہ تفنگ یہ تیغ و سناں بھی دیکھ
اور کشتۂ نگار دل آرا ادھر بھی آ

آ، اور بگل کا نغمۂ "جاں آفریں" بھی سن
آ، بے کسوں کا نالۂ اندوہگیں بھی سن
آ، باغیوں کا زمزمۂ آتشیں بھی سن
او مست ساز و بربط و نغمہ ادھر بھی آ

تقدیر کچھ ہو، کاوش تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرت فردا ادھر بھی آ

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعی خام بھی ہوتی رہی
اہل دل پر بارش الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے
ابن مریم بھی اُٹھے موسیٰ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہاماں بھی اُٹھے
اہل سیف اُٹھتے رہے اہل کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابر رحمت بن کے چھایا دھر پر اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منت کشش ارباب عرفاں ہی رہا
درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی، پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

اہل باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سلسلے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتل عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام
ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی، اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

شکوۂ مختصر

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی اُن زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں اُن پاک باطن نکتہ چینوں سے
لب معجز نمانے، جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے اُن پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنہوں نے فطرت شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں دیر و حرم کے آستانوں سے
وہ، جن کے در پہ کی ہے مدتوں میں نے جبیں سائی
مجھے شکوہ نہیں افتادگان عیش و عشرت سے
وہ، جن کو میرے حال زار پر اکثر ہنسی آئی

مجھے شکوہ نہیں اُن صاحبان جاہ وثروت سے
نہیں آتی میرے حصہ میں جن کی ایک بھی پائی
زمانہ کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن، آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

گریز

یہ جاکر کوئی بزم خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں میں
مبارک تمہیں قصر و ایواں تمہارے
وہ دلدادۂ قصر و ایواں نہیں میں
جوانی بھی سرکش، عبث بھی سرکش
وہ زندانیٔ زلف پیچاں نہیں میں
تڑپ میری فطرت، تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمی پیکان مژگاں نہیں میں
دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن
وہ نوحہ گر درد ہجراں نہیں میں
بہ ایں تشنہ کامی، بہ ایں تلخ کامی
رہین لب شکر افشاں نہیں میں
شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرق شراب و شبستاں نہیں میں

قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی
کہ شاعر تو ہوں، اب غزل خواں نہیں ہیں

شہرِ نگار

رخصت اے ہم سفرو شہرِ نگار آ ہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا

یہ جنوں زار مرا، میرے غزالوں کا جہاں
میرا نجد آ ہی گیا، میرا تتار آ ہی گیا

آج پھر تا بہ چمن درپئے گلہائے چمن
گنگنا تا ہوا زنبور بہار آ ہی گیا

گیسوؤں والوں میں، ابرو کے کمانداروں میں
ایک صید آ ہی گیا، ایک شکار آ ہی گیا

باغبانوں کو بتاؤ، گل و نسریں سے کہو
اک خراب گل و نسرین بہار آ ہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا

زلف کا ابر سیہ بازوئے سیمیں پہ لئے
پھر کوئی زخمہ زن ساز بہار آ ہی گیا

ہو گئی تشنہ لبی آج رہیں کوثر
میرے لب پر لب لعلین نگار آ ہی گیا

آہنگِ نو

اے جوانانِ وطن روحِ جواں ہے تو اُٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اُٹھو
خوف بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اُٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اُٹھو

اُٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

ایک اک سمت سے شب خون کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشقِ جفاکاری ہے
محفلِ زیست پہ فرمانِ قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بمباری ہے

یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیارے ہیں
یہ سرِدوش ہوا موت کے ہرکارے ہیں

اُس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں

ظلم پر ظلم ہیں، تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی!
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی!

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشاں و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اٹھ جاؤ تو بے کار چلے آتے ہیں

خوں جو بہ نکلا ہے اُس خوں میں بہادو ان کو
اُن کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو ان کو

رنگ گلہائے گلستان وطن تم سے ہے
شورش نعرۂ رنداں وطن تم سے ہے
نشۂ نرگس خوبان وطن تم سے ہے
عفت ماہ جبینان وطن تم سے ہے

تم ہو غیرت کے امیں، تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس تمہیں ہے کہ نہیں

یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حامل آداب و روایات کہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برق خرمن

خطۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں!
آ ہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں
مرد و زن پیر و جواں ان کے مظالم کے شکار
خون معصوم میں ڈوبی ہوئی ان کی تلوار

یہ قیامت کے ہوسناک غضب کے خوں خوار
ان کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار
یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
ان کی توپوں کے دہن کر دو انہی کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو ان کو!
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو!

پھونک دو ان کو جلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو

یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دم ساز بھی ہیں
روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگیٔ فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں

دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

عشرتِ تنہائی

میں کہ مے خانۂ الفت کا پرانا مے خوار!
محفل حسن کا اک مطرب شیریں گفتار!
ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزل خواں ہوں میں

کتنے دل کش مرے بت خانۂ ایماں کے صنم
وہ کلیساؤں کے آہو، وہ غزالانِ حرم
میں ہمہ شوق و محبت، وہ ہمہ لطف و کرم
مرکز مرحمت محفل خوباں ہوں میں

موجزن ہے مئے عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کم تر مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پر افشاں مرے رومانوں میں
یاس کی سعیٔ جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
روح گلزار ہوں میں جان گلستاں ہوں میں

لاکھ مجبور ہوں میں ذوق خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرت تنہائی سے
آنکھ مجبور نہیں ہے مری بینائی سے
محرم درد و غم عالم انساں ہوں میں

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیض مئے و ساقی و مے خانہ ہو
رند ہوں اور جگر گوشۂ رنداں ہوں میں

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

عیادت

یہ کون آگیا رخ خنداں لئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نور کا طوفاں لئے ہوئے
بیمار کے قریب بصد شان احتیاط!
دلداریٔ نسیم بہاراں لئے ہوئے
رخسار پر لطیف سی اک موج سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوار تمکنت
تابندگیٔ صبح درخشاں لئے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروان نکہت بستاں لئے ہوئے
آ ہی گیا وہ میرا نگار نظر نواز!
ظلمت کدے میں شمع فروزاں لئے ہوئے
اک اک ادا میں سینکڑوں پہلو سے دلربی
اک اک نظر میں پرسش پنہاں لئے ہوئے

میرے سواد شوق کا خورشید نیم شب
عزم شکست ماہ جبیناں لیے ہوئے
درس سکون و صبر بہ ایں اہتمام ناز
نشتر زنیٔ جنبش مژگاں لیے ہوئے
آنکھوں سے ایک روشنی نکلتی ہوئی ہر آن
غرقابیٔ حیات کا ساماں لیے ہوئے
ہلتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے
یہ کون ہے مجاز سے سرگرم گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لیے ہوئے

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے
لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مئے ناب لیے
ہر نفس رو میں لیے شورش طغیان نہاں
ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لیے
سحر و اعجاز لیے جنبش مژگان دراز
خندۂ شوخ، جمال دُرِ خوش آب لیے
ضوفگن روئے حسیں پر شب مہتاب شباب
چشم مخمور، نشاط شب مہتاب لیے

نشۂ ناز جوانی میں سراپور ادا
جسم ذوق گہر، اطلس و کم خواب لئے
زلف، شب رنگ لئے صندل و عود و عنبر
خم ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے
لب گل رنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزش سیماب لئے
ایک صیاد خوش اندام سواد مشرق
زلف بنگال لئے، طلعت پنجاب لئے
نزہت و ناز کا اک پیکر شاداب و جمیل
نکہت و نور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے
میری وارفتگیٔ شوق مسلم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لئے

آج بھی

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں
آج بھی خارزار غم خلد بریں مرے لئے
آج بھی رہ گذار عشق میرے لئے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں میں ساز جنوں لئے ہوئے
سوز نہاں سے آج بھی روح تپاں ہے دل تپاں

آج بھی زندگی مری غرق شراب تند و تیز
آج بھی ہاتھ میں مرے جام شراب ارغواں
آج بھی ہے رچی ہوئی آج بھی ہے بسی ہوئی
میرے نفس میں خلد کی نزہت و نکہت جواں
آج بھی نکتہ چیں ہوں میں خلوتیان خاص کا
خلوتیاں خاص کا آج بھی ہوں مزاج داں
آج بھی اشک خوں مرا قشقۂ جبین ناز کا
آج بھی خاک دل مری سرمۂ چشم گل رخاں
آج بھی ہے زباں مری خنجر بے نیام شوق
بحث طلب ہے آج بھی جرأت و شوخیٔ بیاں
آج بھی دل کو ہے مرے دولت آگہی نصیب
آج بھی ہے نظر مری ارض و سما کی رازداں
آج بھی ہے جنوں مرا دیر و حرم پہ خندہ زن
آج بھی مجھ سے بدحواس دیر و حرم کے پاسباں
آج بھی سازے مرے گرمیٔ بزم سرکشی
آج بھی آتش سخن شعلہ فشاں شرر فشاں
آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجاز
دفتر شہر یار میں میرے جنوں کی داستاں

لکھنؤ

فردوسِ حسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ
صبر آزما ہے غمزۂ ترکانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ
ہر سمت اک ہجومِ نگاران لکھنؤ
اور میں کہ ایک شوخ غزل خوانِ لکھنؤ
مطرب بھی ہے شراب بھی ابرارِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ
تولے ہوئے ہے تیغ و سناں حسن بے نقاب
ناوک فگن ہے جلوۂ پنہانِ لکھنؤ
اک نو بہار کو تاکے ہے پھر نگاہ،،
وہ نو بہار ناز کہ ہے جانِ لکھنؤ
دستِ جنوں کو روکیے یہ خبط چھوڑیے
رسوا ہے یونہی چاک گریبانِ لکھنؤ
کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور کیا
کیوں بدگماں ہوں یوسفِ کنعانِ لکھنؤ
اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجھے جانا ہے اک دن!

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اُٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے بس حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئین فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی!
ابھی یہ زندگی داد صداقت دے نہیں سکتی!
ابھی انسانیت دولت سے ٹکر لے نہیں سکتی!
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کرکے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریک طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیر زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشک خوں بہانا ہے
ابھی پامال جور آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی ہر دشمن نظم کہن کے گیت گانا ہے
ابھی ہر لشکر ظلمت شکن کے گیت گانا ہے
ابھی خود سرفروشاں وطن کے گیت گانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

کوئی دم میں حیات نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بایمائے حمیت جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤں گا میں جاؤں گا میں جاتا ہوں میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

شرارے

خود کو بہلانا تھا آخر خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوز دروں ہنستا رہا گاتا رہا
مجھ کو احساس فریب رنگ و بو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریب رنگ و بو کھاتا رہا

مری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پر ایک وا ہونے لگا
اک نگار ناز کی پھرنے لگیں آنکھیں مجاز
اک بت کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

عین ہنگام طرب روح طرب تھرا گئی
دفعتاً دل کے اُفق پر اک گھٹا سی چھا گئی
ایک آغوش تمنا کا تقاضا دیکھ کر
ایک دل کی سرد مہری بھی مجھے یاد آ گئی

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟

میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے اُتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمان محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاری عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بستر مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسین خواب تھی دنیا میری

جنت شوق تھی بیگانہ آفات سموم
درد جب درد نہ ہو کاوش درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم

لیلیٰ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لیے دعوت خواب آتی تھی

سنگ کو گوہر نایاب و گراں جانا تھا
دشت پرُ خار کو فردوس جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آب رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا

میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے راز غم و حسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز، مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار

وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟

HaSnain Sialvi

الہ آباد سے

بتاریخ ۲ فروری ۱۹۴۵ء جس دن سنگم کی رومان خیز سرزمین پر جشن سالگرہ منانے والے شاعر کی سالگرہ منائی گئی۔

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ "ذلی کا شرابی" آ گیا ہے
بہ صد آوارگی، با صد تباہی
بہ صد خانہ خرابی آ گیا ہے
گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ
کہ شیدائے گلابی آ گیا ہے
نگاہوں میں خمار بادہ لے کر
نگاہوں کا شرابی آ گیا ہے
وہ سرکش، رہزن ایوان خوباں
بہ عزم باریابی آ گیا ہے
وہ رسوائے جہاں، ناکام دوراں
بہ زعم کامیابی آ گیا ہے
بتان ناز فرما سے یہ کہہ دو
کہ اک ترک شہابی آ گیا ہے
نوا سنجان سنگم کو بتا دو
حریف فاریابی آ گیا ہے
یہاں کے شہریاروں کو خبر دو
کہ مرد انقلابی آ گیا ہے

بول! اری او دھرتی بول!

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

بادل، بجلی، رین اندھیاری   دکھ کی ماری پرجا ساری
بوڑھے، بچے سب دکھیا ہیں   دکھیا نر ہیں دکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے   سب بنیے ہیں سب بیوپاری

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

کلجگ میں جگ کے رکھوالے   چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں   نیلے پیلے گورے کالے
مکھن بھنگے بھن بھن کرتے   ڈھونڈتے ہیں مکڑی کے جالے

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

کیا افرنگی کیا تاتاری   آنکھ بچی اور برچھی ماری
کب تک جنتا کی بے چینی   کب تک جنتا کی بے زاری
کب تک سرمایہ کے دھندے   کب تک یہ سرمایہ داری

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانواڈول

نامی اور مشہور نہیں ہم   لیکن کیا مزدور نہیں ہم

دھوکہ اور مزدوروں کو دیں ایسے تو مجبور نہیں ہم
منزل اپنے پاؤں کے نیچے منزل سے اب دور نہیں ہم

بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

بول کہ تیری خدمت کی ہے بول کہ تیرا کام کیا ہے
بول کہ تیرے پھل کھائے ہیں بول کہ تیرا دودھ پیا ہے
بول کہ ہم نے حشر اُٹھایا بول کہ ہم سے حشر اُٹھا ہے

بول کہ ہم سے جاگی دنیا
بول کہ ہم سے جاگی دھرتی
بول! اری او دھرتی بول!
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے
زندگی، خاک و خون میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لیے

دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے روح بربادی
بربریت کے کاروانوں سے
زلزلے میں ہے سینۂ گیتی

ذوق پنہاں کو کامراں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک پیمانۂ مئے سرجوش
لطف گفتار، گرمیٔ آغوش
بوسے — اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو بیری کشت ہوش

روح یخ بستہ ہے تپاں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار

کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

پھر کہاں یہ حسیں، سہانی رات
یہ فراغت، یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیِ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکین شورشِ جذبات

آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات، اور آج کی رات

آج

کارفرما پھر مرا ذوقِ غزل خوانی ہے آج
پھر نفس کا ساز گرمِ شعلہ افشانی ہے آج

پھر نگاہ شوق کی گرمی ہے اور روئے نگار
پھر عرق آلود اک کافر کی پیشانی ہے آج

پھر مرے لب پر قصیدے ہیں لب و رخسار کے
پھر کسی چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

حسن اس درجہ نشاط حسن میں ڈوبا ہوا
انکھڑیاں بے خود تبسم زلف دیوانی ہے آج

لرزش لب میں شراب و شعر کا طوفان ہے
جنبش مژگاں میں افسون غزل خوانی ہے آج

وہ نفس کی زمزمہ سنجی نظر کی گفتگو
سینۂ معصوم میں اک طرفہ طغیانی ہے آج

یاں بہ ایں عالم غرور یوسفیت بھی نہیں
واں زلیخائی بہ عزم چاکدامانی ہے آج

واں اشارے ہیں بہک جانا ہی عین ہوش ہے
ہوش میں رہنا یقیناً سخت نادانی ہے آج

کش مکش سی کش مکش میں ہے مذاق عاشقی
کامراں سی کامراں ہر سعیٔ امکانی ہے آج

حسن کے چہرے پہ ہے نور صداقت کی دمک
عشق کے سر پر کلاہ فخر انسانی ہے آج

شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
میں نے اُن کی شکل بھی مشکل سے پہچانی ہے آج

بتانِ حرم

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرم نوا
نغمۂ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینان تمدّن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
ناز پروردہ حسیں، افکار غم سے بے نیاز
مہ جبینان حریم، قید حرم سے بے نیاز
جن کی اک جنبش سے بنیاد حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیر قدامت پاش پاش
بن گیا تھا یک بیک فردوس کیف و انبساط
ایک دیرینہ کرم فرما کا ایوان نشاط
نرم صوفے گود میں فردوس رعنائی لئے
زلف کے خم، مرمریں شانوں کی برنائی لئے
وہ حسیں پیشانیاں آئینہ تمکین ناز
وہ رسیلی مدھ بھری آنکھیں وہ مژگان دراز
وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آدرز فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار
رُخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش
چست پیراہن، نمایاں جسم سیمیں کی تراش

شوخ آنکھیں بادۂ گلگوں کے پیمانے لئے
گیسوئے شب رنگ پیچ و خم میں افسانے لئے
آہ وہ حسن مقابل وہ جمال ہمنشیں
دامن موج ہوا میں اک بہشت عنبریں
اک طرف سحر ملاحت، اک طرف افسون ناز
اک طرف زلف بریدہ، اک طرف زلف دراز
آنچلوں کی سرسراہٹ، زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہت خلد بریں آتی ہوئی
آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب
وہ حجاب آگیں تکلم، وہ رسیلے قہقہے!
وہ نشاط آگیں تبسم، وہ سریلے قہقہے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی نے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت
جام زریں کی کھنک سی قلقل مینا کے ساتھ
قدسیوں کی لے سرود بربط زہرا کے ساتھ
شوخیٔ لب ناز فرما خندۂ بے باک پر
نور و موسیقی کی اک بارش سی فرش خاک پر
گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمند ناز سے

وہ لچک سی جسم نازک میں خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلیں تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے
وہ سمٹنے کی ادا طوفان رعنائی کے ساتھ!
ذوق خود بینی مذاق بزم آرائی کے ساتھ
عارضوں پر اک گلابی پن سا ماتھوں پر دمک
انگھڑیوں میں اک سرور فتح مندی کی جھلک
بام و در پر اک تبسم سا، فضا گل رنگ تھی!
جنبش مژگاں دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی
میرا نغمہ باعث دلداریٔ خزاں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاط جاں تو ہے

پہلا جشن آزادی

بہ صد عزور، بہ صد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھل گئی زلف دراز آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح ساز آزادی

زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موج نور آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرور آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضور آزادی
ہر ایک قصر ہے اک بام طور آزادی

ہر ایک بام پہ اک پرچم زر افشاں ہے

ہر ایک سمت نگاران یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیل نور ہے، خیرہ ہے آدمی کی نظر
بہ صد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر

زمین ہند کہ جولانگہ غزالاں ہے

صدا دو انجم افلاک رقص فرمائیں
بتان کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریک حلقۂ ادراک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہے بے باک رقص فرمائیں

کہ یہ بہار پیامیٔ صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعیٔ جنوں خیز کامیاب نہیں

یہ انتہا نہیں، آغاز کار مرداں ہے

وطن آشوب

سبزہ و برگ دلالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا
سارا چمن اُداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا
اک سکوت ہر طرف ہوشربا و ہولناک
خلد وطن کے پاسباں خلد وطن کو کیا ہوا
رقص طرب، کدھر گیا، نغمہ طراز کیا ہوئے
غمزہ و ناز کیا ہوئے عشوہ و فن کو کیا ہوا
جس کی نوائے دلستاں زخمہ ساز شوق تھی
کوئی بتاؤ اس بُت، غنچہ دہن کو کیا ہوا
چشمک دم بدم نہیں، مشق حزام و رم نہیں
میرے غزال کیا ہوئے، میرے ختن کو کیا ہوا
چھائی ہے کیوں فسردگی عالم حسن و عشق پر
آج وہ نل کدھر گئے آج دمن کو کیا ہوا

آنکھوں میں خوف و یاس ہے چہرہ اداس اداس ہے
عصرِ رواں کی لیلیٰ برقع فگن کو کیا ہوا
آہ خرد کدھر گئی، آہ جنوں نے کیا کیا؟
آہ شباب، خوگرِ دار و رسن کو کیا ہوا
کوئی بتائے عظمتِ خاکِ وطن کہاں ہے اب
کوئی بتائے غیرتِ اہلِ وطن کو کیا ہوا
کوہ وہی دمن وہی، دشت وہی چمن وہی
پھر یہ مجاز جذبۂ حبِ وطن کیا ہوا

فکر

نہیں ہر چند کسی گمشدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلد طرب ناک کا ارماں ہے ضرور
بزمِ دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

مٹ گئے، برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کار فرما ہے کوئی تازہ جنون تعمیر
دل مضطر ابھی آماجگہ یاس نہیں!

تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

مہوشوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گہ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانگہ اربابِ نظر کیوں ہو جائے

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہے
دشتِ ظلمات سے آخر کو گزرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارہ بھی تو ہے

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہ کنعاں نہ بنی

بہ ایں انعام و قائف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقف غم خاک نشیناں کردے
خون دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خون دل نذر چمن بندیٔ دوراں کردے

سانحہ

(گاندھی جی کی موت سے متاثر ہوکر)

درد و غم حیات کا درماں چلا گیا
وہ حضور عصر و عیسٰی دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
رقصاں چلا گیا، نہ غزل خواں چلا گیا
سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا
برہم ہے زلف کفر، تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخر کفر و نازش ایماں چلا گیا
بیمار زندگی کی کرے کون دل دہی
نباض و چارہ ساز مریضاں چلا گیا
کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی
وہ محرم نزاکت عصیاں چلا گیا

وہ رازدار محفل یاراں نہیں رہا
وہ غم گسار بزم حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و راہ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بے خود سرور دل و جاں نہیں رہا
اک عاشق صداقت پنہاں چلا گیا

با چشم نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسف زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و حدف سربلند ہیں
تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغ خونچکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیو بدی سے معرکۂ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زور جواناں چلا گیا

کیا اہل دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا عزم سرفروشی مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتش دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شباب حشر بداماں چلا گیا
خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

خراجِ عقیدت

اک نیا پیغمبر امن و اماں پیدا ہوا
کارواں میں اک امیر کارواں پیدا ہوا
ایک خضر عصر حاضر، اک کلیم عہد نو
ایک صدر محفل روحانیاں پیدا ہوا
اک مُدی خوان محبت، اک نقیب اتحاد
اک فدائے سوز ناقوس و اذاں پیدا ہوا
حق کا سودائی حقیقت کا علم کھولے ہوئے
صدق کا شیدا، صفا کا پاسباں پیدا ہوا
سر بسر اک مژدۂ تسکین مردان ضعیف
قوت بازوئے یاران جواں پیدا ہوا
اس چمن کی سرزمیں ہے روکش ہفت آسماں
اس چمن میں طائر عرش آشیاں پیدا ہوا
اک گل تازہ جو مرجھا کر بھی مرجھایا نہیں
صفحۂ ہستی پہ نقش جاوداں پیدا ہوا

خون سے اس کے آج بھی گل رنگ ہے، خاک وطن
فخر عالم، نازش ہندوستاں پیدا ہوا

زہرابِ حسن

حسن اک کیف جاودانی ہے
اور جو چیز ہے وہ فانی ہے

حسن کے دن بھی کیف پرور ہیں
حسن کی رات بھی سہانی ہے

حسن کی صبح اک شکست جمیل
حسن کی شام کامرانی ہے

یہ کچھ افسانۂ تخیل ہے
کچھ حقیقت کی ترجمانی ہے

کچھ ترے حسن کا کرشمہ ہے
کچھ مری طبع کی روانی ہے

شمعِ رہگزر

زیست بے اختیار گزری ہے
یوں نسیمِ بہار گزری ہے
دل میں برپا قیامتیں کرتی
نگہِ شہسوار گزری ہے
ساغر و ساز دور ہی رکھیے
ورنہ یوں بھی بہار گزری ہے
زمزمہ سنج و زرفشاں نکہت
پھر صبا پر سوار گزری ہے
کیا گزرگاہ ہے محبت کی
خود بخود بار بار گزری ہے
اک دُرِ شاہوارِ صد بستاں
پھر لبِ جوئبار گزری ہے
ہائے شیرینیِ لبِ لعلیں
مسکراتی بہار گزری ہے
وائے طوفانِ سینۂ سیمیں
دخترِ کوہسار گزری ہے
زندگی کی جمیل راہوں سے
خود اجل اشکبار گزری ہے

نیا کشمیر!

اک شرارا جھلملایا اور فضا میں کھو گیا
اک شرارا جانب خلد جواں آیا تو کیا
کوئی طوفاں آئے اک کوہ گراں ہے اس طرف
کوئی طوفاں بر سر کوہ گراں آیا، تو کیا
دست و بازو میں صلابت آ چکی فولاد کی
اب مقابل اک حریف نیم جاں آیا تو کیا
خود حقیقت پر پڑے باطل کا سایہ تا بکے
مہر عالم تاب کے آگے دھواں آیا تو کیا
دیر کی عظمت بھی ہے آخر مسلم ہم نفس
دیر کی محراب تک شور اذاں آیا تو کیا
چند بنیادی عناصر مائل پیکار ہیں
اک نئے کشمیر کی تشکیل کے آثار ہیں!

پاکستان کا ملی ترانہ

آزادی کی دلہن میں کس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گردوں پر چمکا ایک ہلال اک تارا

سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
سرمائے کا سوکھا جنگل اس میں سرخ شرارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

سوا نیزوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر ترک اپنا، ہر حر اپنا، ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر انسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

غزلیں

لیکن دل محروں نہ ہوتی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیٔ کرم کو کیا کہیے بھلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرض وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگی وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

روداد غم اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے!
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اُس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذبِ دل
حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے

ہمنشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری مے خواری ابھی تک راز ہے

ہنس دیے وہ میرے رونے پر مگر
اُن کے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

بنانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

مجھے سنے نہ کوئی مست بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

ہجر میں کیف اضطراب نہ پوچھ
خون دل بھی شراب ہونا تھا

تیرے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرے کو آفتاب ہونا تھا

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا

رات تاروں کا ٹوٹنا بھی مجاز
باعث اضطراب ہونا تھا

یونہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر
بتو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

دکھا دے ایک دن اے حسن رنگیں جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں رہ جائے نظر ہو کر

دل سوز آشنا کے جلوے تھے جو منتشر ہو کر
فضائے دہر میں چمکا کئے برق و شرر ہو کر

وہی جلوے جو اک دن دامن دل سے گریزاں تھے
نظر میں رہ گئے گلہائے داماں نظر ہو کر

فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں معاذاللہ
یہ نالے نارسا ہو کر، یہ آہیں بے اثر ہو کر

یہ کس کے حسن کے رنگین جلوے چھائے جاتے ہیں
شفق کی سرخیاں بن کر، تجلّیِ سحر ہو کر

رہ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کشش حسن کی دیکھنا چاہتا ہوں

کوئی دل سا درد آشنا چاہتا ہوں
رہ عشق میں رہنما چاہتا ہوں

تجھی سے تجھے چھیننا چاہتا ہوں
یہ کیا چاہتا ہوں یہ کیا چاہتا ہوں

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے پھر
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں

وہ مخمور نظریں، وہ مدہوش آنکھیں
خراب محبت ہوا چاہتا ہوں

وہ آنکھیں جھکیں، وہ کوئی مسکرایا
پیام محبت سنا چاہتا ہوں

تجھے ڈھونڈتا ہوں تری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں

یہ موجوں کی بے تابیاں کون دیکھے
میں ساحل سے اب لوٹنا چاہتا ہوں

کہاں کا کرم اور کیسی عنایت
مجاز اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

سینے میں اُن کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

تاثیر جذب شوق دکھائے ہوئے تو ہیں
ہم تیرا ہر حجاب اُٹھائے ہوئے تو ہیں

ہاں کیا ہوتا وہ حوصلۂ دید اہلِ دل
دیکھو نا وہ نقاب اُٹھائے ہوئے تو ہیں

تیرے گناہ گار، گناہ گار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

اللہ رے کامیابی آوارگانِ عشق
خود گم ہوئے تو کیا اسے پائے ہوئے ہیں

یوں تجھ کو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے
دستِ دعا ہم آج اُٹھائے ہوئے تو ہیں

ذکر اُن کا گر زباں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
اب تک نفس نفس میں سمائے ہوئے تو ہیں

مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجاز
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

خامشی کا تو نام ہوتا ہے
ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے

عشق کو پوچھتا نہیں کوئی
حسن کا احترام ہوتا ہے

آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی
دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے

حسن کو شرمسار کرنا ہی
عشق کا انتقام ہوتا ہے

اللہ اللہ یہ ناز حسن مجاز
انتظار سلام ہوتا ہے

نگاہ لطف مت اُٹھ خوگر آلام رہنے دے
ہمیں ناکام رہنا ہے ہمیں ناکام رہنے دے

کسی معصوم پر بیداد کا الزام کیا معنی
یہ وحشت خیز باتیں عشق بد انجام رہنے دے

ابھی رہنے دے دل میں شوق شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبت کا جنون خام رہنے دے

ابھی رہنے دے کچھ دن سلف نغمۂ مستیٔ صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

کہاں تک حسن بھی آخر کرے پاس رواداری
اگر یہ عشق خود ہی فرق خاص و عام رہنے دے

بہ ایں رندی مجاز اک شاعر مزدور و دہقاں ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خود سوز و ساز ہیں ہم لوگ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

بے سبب التفات کیا معنی؟
کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ

محفل سوز و ساز ہے دنیا!
حاصل سوز و ساز ہیں ہم لوگ

کوئی اس راز سے نہیں واقف
کیوں سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں
بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

سب اسی عشق کے کرشمے ہیں
ورنہ کیا اے مجاز ہیں ہم لوگ

یہ میری دنیا یہ میری ہستی
نغمہ طرازی، صہبا پرستی

شاعر کی دنیا، شاعر کی ہستی
یا نالۂ غم، یا شور مستی

سب سے گریزاں، سب پر برستی
آنکھوں کی مستی، مستی نہ سستی

یا خلد و ساقی اے جذب مستی
یا ٹکڑے ٹکڑے داماں ہستی

محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں
مری نظر میں رفعت نہ پستی

ان انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو
صہبا ہی صہبا، مستی ہی مستی

وہ آ بھی جاتے وہ ہو بھی جاتے
چشمِ تمنا پھر بھی ترستی

اُن کا کرم ہے اُن کی محبت
کیا میرے نغمے کیا میری ہستی

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردہ کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈا کرے کوئی

تم نے تو حکمِ ترکِ تمنا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنا کرے کوئی

دنیا لرز گئی دلِ حرماں نصیب کی!
اس طرح سازِ عیش نہ چھیڑا کرے کوئی

مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

رنگینیٔ نقاب میں گم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی

یا تو کسی کو جرأت دیدار ہی نہ ہو
یا پھر مری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی

ہوتی ہے اس میں حسن کی توہین اے مجاز
اتنا نہ اہل عشق کو رسوا کرے کوئی

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجئے، ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطف بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگِ جاں بھول گئے

حسن پھر فتنہ گر ہے کیا کہیے
دل کی جانب نظر ہے کیا کہیے

پھر وہی رہگذر ہے کیا کہیے
زندگی راہ پر ہے کیا کہیے

حسن خود پردہ در ہے کیا کہیے
یہ ہماری نظر ہے کیا کہیے

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہیے

حسن ہے اب نہ حسن کے جلوے
اب نظر ہی نظر ہے کیا کہیے

آج بھی ہے مجاز خاک نشیں
اور نظر عرش پر ہے کیا کیجے

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ
ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

"آوارہ و مجنوں" ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دل خانہ خراب اور زیادہ

ہوگی مری باتوں سے انہیں اور بھی حیرت
آئے گا انہیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطرب بے باک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقی فیاض شراب اور زیادہ

وہ نقاب آپ سے اُٹھ جائے تو کچھ دور نہیں
ورنہ میری نگہِ شوق بھی مجبور نہیں

خاطر اہلِ نظر حسن کو منظور نہیں
اس میں کچھ تیری خطا دیدۂ مجبور نہیں

لاکھ چھپتے ہو مگر چھپ کے بھی مستور نہیں
تم عجب چیز ہو نزدیک نہیں دور نہیں

جرأت عرض پہ وہ کچھ نہیں کہتے لیکن
ہر ادا سے یہ ٹپکتا ہے کہ منظور نہیں

دل دھڑک اُٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر
اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں

ہائے وہ وقت کہ جب بے پیے مدہوشی تھی
ہائے یہ وقت کہ اب پی کے بھی مخمور نہیں

حسن ہی حسن ہے جس سمت اُٹھاتا ہوں نظر
اب یہاں طور نہیں، برق سرِ طور نہیں

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اُٹھے ہیں خمکدۂ آسماں سے ہم

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگس جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اُٹھے شراب ہو اک بوستاں سے ہم

ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کش مکش امتحاں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
لے سر اُٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاست اہل جہاں سے ہم

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ ہیں مورد عتاب نہیں

یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
ہیں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلم ہیں
مگر وہاں بھی جہاں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

سب ہی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیاب محبت بھی کامیاب نہیں

نہ ہم آہنگ مسیحا، نہ حریف جبریل
تیرا شاعر کہ ہے زندانیٔ گیسوئے جمیل

کس کی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب
کھول دی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل

کس طرف جائیے کہاں جائیے بتا دو کوئی
زلف پر خم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل

عالم یاس میں کیا چیز ہے اک ساغر مے
دشت ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل

کتنی دشوار ہے پیران حرم کی منزل
اس طرف فتنۂ ابلیس اُدھر رب جلیل

اُف یہ طوفان نشاط اور مری طبع حزیں
آہ یہ یورش ناز اور میں مجروح و علیل

آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کا طوفاں
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنے کی دلیل

عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جانا تھا
عشق کو منزل پستی سے گزر جانا تھا

جلوے تھے حلقۂ ہر دام نظر سے باہر
میں نے ہر جلوے کو پابند نظر جانا تھا

حسن کا غم بھی جبیں، فکر جبیں، درد جبیں
اُن کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا

حسن نے شوق کے ہنگامے تو دیکھے تھے بہت
عشق کے دعوے تقدیس سے ڈر جانا تھا

یہ تو کیا کہیے چلا تھا میں کہاں سے ہمدم
مجھ کو یہ بھی نہ تھا معلوم کدھر جانا تھا

حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد مجاز
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا، شوق کامراں اپنا

آہ بے اثر کس کی، نالہ نارسا کس کا
کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا

کب کیا تھا اس دل پر حسن نے کرم اتنا
مہرباں اور اس درجہ کب تھا آسماں اپنا

الجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے
کس قدر تن آساں ہے ذوق رائیگاں اپنا

کچھ نہ پوچھ اے ہمدم ان دنوں مرا عالم
مطرب حسیں اپنا ساقیٔ جواں اپنا

عشق اور رسوائی کون سی نئی شے ہے
عشق تو ازل سے تھا رسوائے جہاں اپنا

تم مجاز دیوانے مصلحت سے بیگانے
ورنہ ہم بنا لیتے تم کو رازداں اپنا

ساقیٔ گلفام با صد اہتمام آ ہی گیا
نغمہ بر لب، خم بہ سر، بادہ بجام آ ہی گیا

اپنی نظروں میں نشاط جلوۂ خوباں لئے
خلوتی خاص سوئے بزم عام آ ہی گیا

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پہ مرا ماہ تمام آ ہی گیا

جھوم جھوم اُٹھے شجر کلیوں نے آنکھیں کھولدیں
جانب گلشن کوئی مست خرام آ ہی گیا

پھر کسی کے سامنے چشم تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگ احترام آ ہی گیا

میری شب اب میری شب ہے میرا بادہ میرے جام
وہ مرا سرو رواں ماہ تمام آ ہی گیا

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا

زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

کھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے مجاز
خیریت گزری کہ شامیں زیر دام آ ہی گیا

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا ہوگا
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے کیا اچھا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دُنیا میں کیا ہوگا

تم بھی مجاز انسان ہو آخر لاکھ چھپاؤ عشق اپنا
یہ بھید مگر کھل جائے گا یہ راز مگر افشا ہوگا

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے
دل کی گہرائیوں سی نکلا ہے

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے
میں نے ان کا جلال دیکھا ہے

جلوۂ طور خواب موسیٰ ہے
کس نے دیکھا ہے کس کو دیکھا ہے

ہائے انجام اس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں
آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے

جب بھی آنکھیں ملیں اُن آنکھوں سے
دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

وہ جوانی کہ تھی حریف طرب
آج برباد جام و صہبا ہے

کون اُٹھ کر چلا مقابل سے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

نہیں یہ فکر کوئی رہبر کامل نہیں ملتا
کوئی دنیا میں مانوس مزاج دل نہیں ملتا

کبھی ساحل پہ رہ کر شوق، طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں رہ کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

شکستہ پا کو مژدہ ، خستگاں راہ کو مژدہ
کہ رہبر کو سراغ جادۂ منزل نہیں ملتا

وہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارماں ہے کیا کہیے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا

یہ قتل عام اور بے اذن قتل عام کیا کہیے
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنہیں قاتل نہیں ملتا

حزن شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکر بیش و کم نہیں ہے

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت
ادھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے

مری برباديوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزم طرب سے کیا اُٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پرنم نہیں ہے

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سے ملانا بھی ہے

محبت کا ہر بھید پانا بھی ہے
مگر اپنا دامن بچانا بھی ہے

جو دل تیرے غم کا نشانہ بھی ہے
قتیل جفائے زمانہ بھی ہے

یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دم بدم
چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے

خرد کی اطاعت ضروری سہی
یہی تو جنوں کا زمانہ بھی ہے

نہ دنیا، نہ عقبیٰ، کہاں جایئے
کہیں اہل دل کا ٹھکانا بھی ہے

مجھے آج ساحل پہ رونے بھی دو
کہ طوفاں میں مسکرانا بھی ہے

زمانے سے آگے تو بڑھیے مجاز
زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہے

دامن دل پہ نہیں بارش الہام ابھی
عشق ناپختہ ابھی، جذب دروں خام ابھی

خود جھجکتا ہوں کہ دعوائے جنوں کیا کیجئے
کچھ گوارا بھی ہے یہ قید در و بام ابھی

یہ جوانی تو ابھی مائل پیکار نہیں
یہ جوانی تو ہے رسوائے مئے و جام ابھی

واعظ و شیخ نے سر جوڑ کے بدنام کیا
ورنہ بدنام نہ ہوتی مئے گلفام ابھی

ہیں بصد فخر یہ زاہد سے کہتا ہوں مجاز
مجھ کو حاصل، شرف بیعت خیام بھی

عاشقی جانفزا بھی ہوتی ہے
اور صبر آزما بھی ہوتی ہے

روح ہوتی ہے کیف پرور بھی
اور درد آشنا بھی ہوتی ہے

حسن کو کر نہ دے یہ شرمندہ
عشق سے یہ خطا بھی ہوتی ہے

بن گئی رسم بادہ خواری بھی
یہ نماز اب قضا بھی ہوتی ہے

جس کو کہتے ہیں نالۂ برہم
ساز میں وہ صدا بھی ہوتی ہے

کیا بتا دو مجاز کی دنیا
کچھ حقیقت نما بھی ہوتی ہے

پر تو ساغر صہبا کیا تھا
رات اک حشر سا برپا کیا تھا

کیوں جوانی کی مجھے یاد آئی
میں نے اک خواب سا دیکھا کیا تھا

حسن کی آنکھ بھی نمناک ہوئی
عشق کو آپ نے سمجھا کیا تھا

عشق نے آنکھ جھکا لی ورنہ
حسن اور حسن کا پردا کیا تھا

کیوں مجاز آپ نے ساغر توڑا
آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا

یہ جہاں بارگہِ رتل گراں ہے ساقی
اور ایک جہنم مرے سینے میں تپاں ہے ساقی

جس نے برباد کیا، مائل فریاد کیا
وہ محبت ابھی اس دل میں جواں ہے ساقی

ایک دن آدم و حوا بھی کئے تھے پیدا
وہ اخوت تری محفل میں کہاں ہے ساقی

ہر چمن دامن گل رنگ ہے خون دل سے
ہر طرف شیون و فریاد و فغاں ہے ساقی

ماہ و انجم مرے اشکوں سے گہر تاب ہوئے
کہکشاں نور کی اک جوئے رواں ہے ساقی

حسن ہی حسن ہے جس سمت بھی اُٹھتی ہے نظر
کتنا پرکیف یہ منظر، یہ سماں ہے ساقی

زمزمہ! ساز کا، پائل کے چھنکے کی طرح
بہتر از شورش ناقوس و اذاں ہے ساقی

میرے ہر لفظ میں بے تاب مرا سوز دروں
میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

دلِ خوں گشتۂ جفا پہ کہیں
اب کرم بھی گراں نہ ہو جائے

تیرے بیمار کا خدا حافظ
تیرے چارہ گراں نہ ہو جائے

عشق کیا کیا نہ آفتیں ڈھائے
حُسن گر مہرباں نہ ہو جائے

مے کے آگے غموں کا کوہِ گراں
ایک پل میں دھواں نہ ہو جائے

پھر مجاز ان دنوں یہ خطرہ ہے
دل ہلاکِ بُتاں نہ ہو جائے

درد کی دولت بیدار عطا ہو ساقی
ہم بھی خواہ سبھی کے ہیں بھلا ہو ساقی

سخت جاں ہی نہیں ہم خود سر و خوددار بھی ہیں
ناوکِ ناز خطا ہے تو خطا ہو ساقی

سعیٔ تدبیر میں مضمر ہے اک آہِ جاں سوز
اس کا انعام سزا ہو کہ جزا ہو ساقی

سینۂ شوق میں وہ زخم کہ لَو دے اُٹھے
اور بھی تیز زمانے کی ہوا ہو ساقی

آندھیاں اٹھی ہیں سنسان ہے میخانۂ شوق

U-109781

گیت

کیسی تباہی آئی

جی بیٹھ گیا، من ہارا　　اب سونا ہے جگ سارا
مرگ پر دُکھ کے کانٹے　　ہر راہ میں گھور اندھیارا
ہر سمت اداسی چھائی
کیسی تباہی آئی

اک جوت جگا کر پل میں　　وہ چاند چھپا بادل میں
اب کوئی نہیں ہے اپنا　　اس جیو کے جنگل میں
ہر سانس ہے ایک دہائی
کیسی تباہی آئی

سپنوں کے محل سب ڈھائے　　آشا کے دیپ بجھائے
پیتا کی آندھی اُٹھی　　دکھ درد کے بادل چھائے
آفت کی گھٹا منڈلائی
کیسی تباہی آئی

دُنیا کو نہ منہ دکھلاؤں　　جاؤں تو کدھر میں جاؤں
یہ دکھ میں کسے بتلاؤں　　یہ درد کسے سمجھاؤں
اب میں ہوں، مری تنہائی
کیسی تباہی آئی

آ رہی ہے نرالی بہار!

جی میں جو کچھ ہے وہ کوئی کیسے کہے　　میری رگ رگ میں نس نس میں مدار ہے
بج رہے ہیں خوشی کے ستار
آ رہی ہے نرالی بہار!

میری آشاؤں نے آج پہلے پہل　　حسرتوں کا بنایا ہے رنگیں محل

کوئی کھولے ہے جس کے دوار
آ رہی ہے نرالی بہار!
سارے ناچیں ہواؤں میں چھاگل بجے میری دنیا سجے اور پل پل سجے
ہر طرف اک انوکھا نکھار
آ رہی ہے نرالی بہار!
میری دنیا ہے کیا جگمگائی ہوئی! ہر طرف زندگی مسکرائی ہوئی!
من ہے کیسی خوشی سے دوچار
آ رہی ہے نرالی بہار!

کون مرے سپنے میں آکر رہ رہ کر مسکائے
امرت رس برسائے
من کی کلی کھل جائے
کون مرے سپنے میں آکر رہ رہ کر مسکائے کوئی یکایک سامنے آکر نین سے نین ملائے
اور کبھی چھپ جائے
چھپ چھپ کر للچائے
کون مرے سپنے میں آکر رہ رہ کر مسکائے جیون کے آکاش پہ چمکے رہ رہ کر مسکائے
سندر روشن نیارا
من میں جوت جگائے
کون مرے سپنے میں آکر رہ رہ کر مسکائے شوخ، سجیلا، رسیلا، چنچل چھیڑ کر تڑپائے
میں روٹھوں وہ منائے
بھلا کر سمجھائے
کون مرے سپنے میں آکر رہ رہ کر مسکائے

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

ادب وتنقید

جدید اصول تنقید	پروفیسر ارشاد علی خان	قیمت ۳۰۰ روپے
قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر	ڈاکٹر انوری بیگم	قیمت ۱۵۰ روپے
تین ناول نگار (قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین)	رضی عابدی	قیمت ۱۰۰ روپے
اردو تفاسیر بیسویں صدی میں	ڈاکٹر سید شاہد علی	قیمت ۳۵۰ روپے
بیانِ غالب شرح دیوانِ غالب	آغا محمد باقر ایم۔اے	قیمت ۲۷۵ روپے

شاعری

آسان کلیات اقبال مع فرہنگ	خواجہ عبدالحمید یزدانی	قیمت ۴۰۰ روپے
کلیات ن۔م۔راشد	ن۔م۔راشد	قیمت ۳۰۰ روپے
کلیاتِ داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۶۰۰ روپے
کلیات مجاز	اسرار الحق مجاز	قیمت ۱۵۰ روپے
مہتاب داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۲۰۰ روپے
آفتاب داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۶۰ روپے
گلزار داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۲۰۰ روپے
مثنوی فریاد داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۲۰ روپے
یادگار داغ	نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی	قیمت ۲۰۰ روپے
بے آواز گلی کوچوں میں	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
بودلک	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
پس اندازِ موسم	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
تنہا تنہا	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
درد آشوب	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
خوابِ گل پریشان ہے	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
سب آوازیں میری ہیں	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
شب خون	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے
غزل بہانہ کروں	احمد فراز	قیمت ۸۰ روپے

Kitabi Duniya
1955, Turkman Gate, Delhi - 6 (INDIA)
E-mail kitabiduniya@rediffmail.com
Ph : 3288452

ISBN-81-87666-30-7